[illegible]

مصنفہ

[illegible] (بی۔ اے۔ ایم ایس سی ایف آر ایس اے

[illegible] فزکس ڈیپارٹمنٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مصنف تحفۂ سائنس۔ بادل کے نیچے

مترجم [illegible] کا پہلا کارنامہ

سنہ ۱۹۳۰ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

سچی شرافت

یعنی

انور اور اقبال کی باتصویر سرگذشت

جس میں

بچوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اصول قصہ کہانی کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

مؤلفہ

فیروز الدین مراد بی۔ اے ایم ایس سی ایف آر ایس اے

صدر شعبہ علم طبیعات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دار الاشاعت پنجاب لاہور

بار اوّل — سنہ ۱۹۳۰ء — قیمت عمر

1

انور

شمالی ہندوستان کے ایک شہر میں، ایک امیر آدمی میرزا جمال بیگ رہتا تھا۔ جمال بیگ کی عمر ۵۰ سال سے کچھ زیادہ تھی، لیکن خدا کی مرضی، اُس کے ہاں صرف ایک ہی بیٹا ہوا تھا جس کا نام انور تھا۔ جمال بیگ کو انور کے ساتھ بہت محبّت تھی۔ وُہ چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا اعلےٰ تعلیم حاصل کرے لیکن انور کی ماں، نعیمہ خاتون اپنے بیجا لاڈ پیار سے اِسے بالکل نہیں پڑھنے دیتی تھی۔ وہ بات بات پر اس کی واری اور صدقہ جاتی تھی اور کہتی تھی کہ میرا لاڈلا لکھنے پڑھنے سے کمزور ہو جائے گا۔ اپنی والدہ کی باتیں سُن کر انور کی طبیعت بھی لکھنے پڑھنے سے اُکتا گئی تھی۔ جب کبھی وُہ کتاب لے کر پڑھنے بیٹھتا، تو بانو اُس

کی کمر میں درد شروع ہو جاتا یا اُس کا سر دُکھنے لگتا تھا۔

چونکہ انور امیرانہ گھرانے میں اللہ امین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لئے اُس کا رکھ رکھاؤ حد مناسب سے زیادہ کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں نے اسے بہت نازک بنا رکھا تھا۔ جب وہ کبھی دوڑنے لگتا۔ وہ اس کی چپٹ چپٹ بلائیں لے کر اسے گود میں اُٹھا لیتی۔ بیچارہ کو شاذونادر ہی پیدل چلنے یا کسی اور قسم کی ورزش کرنے کا موقعہ ملتا تھا۔ گو وہ آٹھ برس کا ہو گیا تھا، تاہم اسے ہوا خوری کے لئے بچہ گاڑی میں باہر بھیجا جاتا تھا۔ وہ دُوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر کھیلنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ کیونکہ زیادہ لاڈ پیار نے اسے چڑچڑا اور مغرور بنا دیا تھا اور وہ بات بات پر اپنے ہم عمروں کے ساتھ لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

دراصل انور ایک خوش باش، ہنس مکھ اور نیک طینت لڑکا تھا۔ لیکن بُری تربیت نے اس کا مزاج بگاڑ دیا تھا۔

بہت سے نوکر اس کا کہا ہر وقت ماننے کے لئے تیار رہتے تھے۔ گھر بھر میں کوئی آدمی اس کی مرضی اور خواہش کے خلاف کوئی بات نہ کہتا۔ خواہ وہ کیسی ہی غلط یا بیہودہ بات منہ سے نکالتا، اس کے ماں باپ اس کو منع نہ کرتے اور نوکروں کی تو کیا مجال تھی کہ اس کی حکم عدولی کر سکیں۔ اس کی منہ مانگی مرادیں بلا حیل و حجت پوری کی جاتی تھیں۔ لیکن ہر ایک قسم کے آرام و آسائش کے باوجود وہ بہت کم خوش رہتا تھا۔ اکثر اوقات وہ مٹھائی یا دیگر ثقیل اشیاء زیادہ مقدار میں کھا کر بیمار ہو جاتا۔ بیماری میں اس کو بہت زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ کڑوی دوائی بالکل نہیں پیتا تھا۔ بعض اوقات وہ ایسی چیزیں مانگتا تھا جن کا دستیاب ہونا بالکل ناممکن ہوتا تھا جب وہ اس کو نہیں ملتی تھیں تو وہ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا۔ چونکہ وہ اپنی ضد کا پکا تھا۔ اس لئے ایسا مچلتا تھا کہ الامان! الحفیظ! کسی کے منائے نہ مانتا۔ غصہ سے آگ بگولا ہو جاتا، قیمتی اشیاء توڑ

پھوڑ ڈالتا اور جب تک اُس کا جوش اپنے آپ فرو نہ ہوجاتا کسی کا کہا نہیں مانتا تھا ۔

ایک دن اُس نے اپنی والدہ سے مچل کر کہا "مجھے آسمان سے چاند اُتار دو" بیچاری نے لاکھ جتن کئے کہ وُہ کسی طرح سے بہل جائے اور ضد نہ کرے، عمدہ عمدہ کھلونے دئے، عجیب وغریب تصویریں دکھائیں ۔ لیکن اُس نے ایک نہ مانی ۔ رو رو کر اپنا بُرا حال کرلیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد میرزا صاحب گھر میں آئے ۔ اُن کو ایک عمدہ تدبیر سوجھی ۔ اُنہوں نے ایک بڑا سا آئینہ منگا کر انور کے سامنے رکھ دیا اور کہا " یہ دیکھو میاں انور ۔ ہم نے تمہاری خاطر چاند آسمان سے اُتار کر آئینے میں بند کرلیا ہے" انور اِس حکمتِ عملی سے خوش تو ہوگیا ۔ لیکن اس کے بعد چھ دِن تک بخار سے بیہوش پڑا رہا ۔

اِسی طرح، ایک دفعہ اُس نے ایک اور عجیب ضد کی ۔ میز پر ایک کٹورے میں پانی اور ایک میں دُودھ رکھا

ہُوا تھا۔ انور نے نوکر کو کہا "پانی اور دودھ ملا دو" جب نوکر نے پانی دودھ میں ڈال دیا تو انور نے نوکر کو حکم دیا۔ "دودھ کو پانی سے الگ کر دو"۔ پھر جب نوکر ایسا نہ کر سکا تو آپ نے اس بیچارے کو خوب پیٹا۔ بعد ازاں خود رو رو کر آنکھیں سُرخ کر لیں اور اس کے بعد کئی دِن تک بیمار رہا۔

اِس طرح آئے دن حکیم ڈاکٹر اس کی نبض دیکھتے رہتے تھے اور وُہ کچھ تو ضدیں کرنے اور کچھ اناپ شناپ مٹھائی اور دیر ہضم چیزیں کھاتے رہنے سے کم و بیش ہمیشہ بیمار رہتا تھا۔ اِس پر طرّہ یہ کہ نہ تو وُہ کوئی کھیل کھیلتا اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر کوئی اور کام کرتا تھا۔ اس بیجا نزاکت کا نتیجہ یہ تھا کہ ذرا تیز ہوا چلی اور اسے زکام ہو گیا۔ تھوڑی سی بوندیں پڑیں اور اس کو بخار ہو گیا۔ اس کو ہمیشہ اپنے ریشمی کپڑوں کے خراب ہونے کا خیال رہتا تھا۔ اس کی ماں اسے دھوپ میں باہر نکلنے سے منع کرتی تھی تاکہ اس کا گورا

چڑا رنگ میلا نہ ہو جائے ۔ دو نوکر سایہ کی طرح ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے تھے ۔ اگر کبھی وہ خدا خدا کر کے چند قدم پیدل چلتا تو ایک نوکر اسے چھاتا لگاتا تھا اور جب وہ تھک جاتا تو دوسرا نوکر اسے جھٹ پٹ گود میں اٹھا لیتا ۔

جب مہمان گھر میں آتے تو وہ سب سے پہلے دسترخوان پر جا بیٹھتا اور اوپر اوپر سے چیزیں اٹھا کر کھانا شروع کر دیتا ۔ چاء پیتے ہوئے وہ اکثر اوقات تمام برتن میز پر سے گرا دیتا ۔ اس کی بری عادات کے باعث، گھر سے باہر اسے سب لوگ دل سے ناپسند کرتے تھے ۔ ان بری عادتوں کی وجہ سے اسے خود بھی بہت نقصان پہنچتا تھا ۔ کبھی وہ اپنا ہاتھ چاقو سے کاٹ لیتا اور کبھی اپنے اوپر بھاری چیزیں گرا لیتا تھا ۔ چنانچہ ایک دفعہ اس نے کھولتے ہوئے پانی کا دیگچہ اپنے اوپر گرا لیا اور بمشکل تمام مرنے سے بچا ۔ خلاصہ مطلب یہ کہ ناقص تربیت اور ماں باپ کے بیجا لاڈ پیار سے، انور کے مزاج کی افتاد بہت برے

انداز سے ہوئی تھی نہ تو اُسے لکھنا پڑھنا آتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر کوئی کام کر سکتا تھا ۔ اُس کو اپنی امارت کا بہت گھمنڈ تھا اور وہ غریبوں سے بہت نفرت کرتا تھا۔

اقبال

جمال منزل کے قریب ہی ناظر کسان کا جھونپڑا تھا ناظر کسان، ہل جوت کر، اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پالتا تھا۔ میرزا جمال بیگ کی طرح اُس کا بھی ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام اقبال تھا ۔ اقبال کھیتوں میں دوڑنے، متفرق کام کاج کرنے، اور گائے بھینسوں کو چراگاہ تک ہانک کر لے جانے کا عادی تھا۔ اس لیے وُہ خوب مستعد اور چست وچالاک تھا ۔ گو وُہ عمر میں انور سے ایک سال چھوٹا تھا لیکن دیکھنے میں اس سے زیادہ

مضبوط اور طاقتور اور چست و چالاک تھا۔ وہ انور کی طرح نازک اندام اور خوش رنگ نہ تھا۔ لیکن اس کے سڈول اعضاء اور نکھرا ہوا رنگ بہت بھلے معلوم ہوتے تھے وہ صحت اور خوش مزاجی کا پتلا تھا سب لوگ اس سے خوش تھے اور وہ دوسروں کی خدمت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اگر کھانا کھاتے ہوئے کوئی بھوکا سائل اس کے پاس آتا تھا۔ تو وہ خوشی سے اپنا آدھا کھانا اسے دے دیتا۔ وہ اتنا رحم دل تھا کہ جانوروں کو بھی نہ ستاتا، نہ ان کے گھونسلوں میں سے انڈے بچے نکالتا اور نہ انہیں اپنی تفریح کے لئے جان سے مارتا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ گو یہ جانور بے زبان ہیں اور اپنے دل کی بات ظاہر نہیں کر سکتے تاہم انہیں بھی انسانوں کی طرح درد کا احساس ہوتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر چیونٹی یا کیڑے پر بھی پاؤں نہ رکھتا تھا۔ اگر کبھی کوئی کیڑا مکوڑا نادانستہ اس کے پاؤں کے نیچے دب کر مر جاتا تو اس کو بہت افسوس ہوتا۔ وہ اس بات کو

اچھی طرح سمجھتا تھا کہ چیونٹیوں اور کیڑوں مکوڑوں کو پیدا کرنے والا بھی وہی خدا ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اُس کو یہ بات سکھائی گئی تھی کہ اگر دنیا بھر کے تمام سیانے آدمی مِل کر کوشش کریں تو بھی وُہ ایک زندہ چیونٹی نہیں بنا سکتے، گو چیونٹی ایک حقیر سا جانور ہے تاہم اس کے بنانے کے لئے بھی خدا کی ضرورت ہے۔ پس آدمی کو خدا کا کام ہرگز نہیں بگاڑنا چاہیئے۔ دانائی اور ہمدردی کی یہ باتیں بخوبی اُس کے ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ جب وہ کھیتوں میں سے گزرتا تو گائے بیلوں کے لئے ہری ٹہنیاں جمع کر لیتا۔ گاؤں کے تمام آدمی اس کو اچھّا لڑکا کہتے تھے اور اس سے بہت خوش تھے۔ وُہ ماں باپ کا تابعدار رہتا تھا اور کبھی کوئی بُرا کام یا ضد نہ کرتا تھا۔

پروفیسر ابراہیم صاحب

جس گاؤں میں اقبال رہتا تھا۔ اُس کے پاس ہی

ایک مشہور عالِم، پروفیسر ابراہیم صاحب رہتے تھے۔ پروفیسر صاحب کا سن ساٹھ سال سے متجاوز تھا لیکن وُہ ایک جوانِ ہمّت بزرگ تھے۔ اُن کی ساری عمر گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے گزری تھی۔ اب وہ نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ رہے تھے۔ کالج سے اُن کو اِتنی پنشن ملتی تھی کہ اس سے اُنکی بسرِ اوقات اچھی طرح ہو جاتی۔ رہنے کے لئے اُنہوں نے دیہات میں ایک عالیشان کوٹھی بنائی ہوئی تھی۔ وہ بڑے مخیر آدمی تھے۔ وُہ ڈاکٹر نہ تھے۔ تاہم مُفت تقسیم کرنے کے لئے چند مفید ادویہ مثلاً کونین کی گولیاں، اسپرین، ویزلین، بورک ایبسڈ، کیلومل، مگنیشیا، امرت دھارا وغیرہ اپنے پاس ضرور رکھتے تھے جاہل کسان انہیں فرشتۂ رحمت خیال کرتے تھے اور وُہ جہاں کہیں جاتے، سب لوگ اُن کی بہت تعظیم و تکریم کرتے۔

پروفیسر صاحب کو چھوٹے بچّوں سے بہت اُلفت تھی دیہات کے لڑکے لڑکیاں انہیں چچا ابراہیم کہتے اور وُہ انہیں بیٹا جان اور بیٹی جان کہتے ہوئے کبھی نہ تھکتے تھے۔

پروفیسر صاحب کو اقبال کے ساتھ غیر معمولی زیادہ محبّت تھی۔ جب کبھی وہ ناظر کسان سے مِلتے، اس کو اقبال کی خبرگیری کی تاکید کرتے اور کہتے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ خدا نے چاہا تو ایک دِن تمہارا اقبال دُنیا میں بہت بڑا آدمی ہو کر عزّت پائے گا" انہوں نے اقبال کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا اور اب وہ اکثر اوقات انہیں کے پاس رہتا اقبال لکھنے پڑھنے میں بہت تیز تھا۔ اس کی ایک نیک عادت یہ تھی کہ جو کام کرتا دل لگا کر کرتا۔ پروفیسر صاحب نے اِسے سکھایا تھا کہ ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا چاہیئے یعنی اگر انسان کتاب لے کر پڑھنے بیٹھے تو اس کا دھیان کھیل کود کی طرف نہیں جانا چاہیئے اور جب انسان کھیل کود میں مصروف ہو تو اسے بے فکر ہو کر کھیلنا چاہیئے۔ چونکہ اقبال بُہت ذہین اور سمجھدار لڑکا تھا۔ اِس لئے پروفیسر صاحب جو کچھ بتلاتے بہت جلد سمجھ لیتا اور ایک دفعہ سمجھ لینے کے بعد پھر کبھی نہ بھولتا۔ سب سے بڑھ کر اقبال میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ

سچ بولنے کا عادی تھا جھوٹ کبھی نہیں بولتا تھا ۔ خواہ اُسے جھوٹ بولنے سے کسی عمدہ چیز کے ملنے کی اُمید ہوتی تاہم وہ سچ بولتا تھا ۔ اس کے علاوہ وہ دوسرے بچوں کی طرح، مٹھائی اور دیگر متفرق چیزیں کھانے کا شائق نہ تھا ۔ خشک روٹی اور پانی کے ایک گھونٹ سے اپنا پیٹ بھر کر، اقبال ویسا ہی خوش رہتا تھا جیسے دوسرے بچے لذیذ کھانے کھا کر خوش ہوتے ہیں یہ سب نیک باتیں اس نے اپنے ماں باپ اور چچا ابراہیم سے سیکھی تھیں ۔

انور اور اقبال کی ملاقات

انور اور اقبال کی ملاقات ایک عجیب طریقے سے ہوئی ۔ ایک دن انور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر سیر کے لئے باغ کو گیا ۔ اس کے ہمراہ ایک نوکر تھا ۔ ایک جگہ پر خوش نما جنگلی

پھول اُگے ہوئے تھے۔ رنگ رنگ کی تتلیاں اُن کے اُوپر کھیل رہی تھیں اور ان میں سے شہد چوس رہی تھیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر انور پھول توڑنے اور تتلیاں پکڑنے کے واسطے گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ گھاس لمبی تھی، جونہی کہ انور نے قدم نیچے رکھا۔ ایک لمبا سانپ اُس کی ٹانگ کے گرد لپٹ گیا۔ انور اور نوکر سانپ کو دیکھ کر بالکل سہم گئے۔ نوکر تو چیختا ہوا مدد کے لئے بھاگ گیا اور انور اس قدر ڈر گیا کہ اپنی ٹانگ بھی نہ جھٹک سکا۔ اتفاق سے اقبال کہیں قریب ہی کھیل رہا تھا۔ نوکر کی چیخ پکار سن کر وُہ انور کے پاس آیا اور خیریت دریافت کی۔ انور کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ اِس لئے اس کے مُنہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا اس نے صرف اپنی ٹانگ کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا گو اقبال انور سے چھوٹا تھا۔ تاہم اُس نے اس کو تسلی دی اور فوراً سانپ کو گردن سے پکڑ کر بہادری اور عقلمندی سے انور کی ٹانگ سے الگ کر کے دُور پھینک دیا ⁂

نعیمہ کی شکرگزاری

نوکر کی چیخ پکار سُن کر نعیمہ خاتون، اور بہت سے ملازم گھبرا کر کوٹھی سے باہر نکل آئے اور دوڑے ہوئے اس جگہ پہنچے۔ جہاں انور اپنے چھوٹے محسن کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اب انور کی جان میں جان آ گئی تھی۔ اُس کی والدہ نے اُس کا منہ سر چوما، اُس کی بلائیں لیں اور اس سے پوچھا کہ اس کو کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔

انور نے جواب دیا "نہیں امّاں جان۔ لیکن اگر یہ بہادر لڑکا اس بدصورت جانور کو میری ٹانگ سے الگ نہ کرتا تو وُہ ضرور مجھے ڈس لیتا"۔

نعیمہ خاتون نے کہا "میرے اچھے بچے! تم کون ہو؟ تم نے میرے پیارے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ میں تمہاری بہت مشکور ہوں"۔

"بیگم صاحبہ مجھے اقبال کہتے ہیں" ۔

"شاباش اقبال تم بہت بہادر لڑکے ہو ۔ میں تم سے بہت خوش ہوں ۔ ہمارے ساتھ آؤ اور کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ" ۔

"نہیں بیگم صاحبہ ۔ میں آپ کا شکریہ عرض کرتا ہوں لیکن میں آپ کے ہمراہ نہیں جا سکتا ۔ میرا باپ میرا راستہ دیکھتا ہوگا" ۔

"میرے چھوٹے بہادر لڑکے ۔ تمہارا باپ کون ہے؟ میں ابھی اس کے پاس اطلاع بھیجتی ہوں کہ تم ہمارے ہاں ہو" ۔

"میرے باپ کو ناظر کسان کہتے ہیں اور ہم موضع مراد پور میں رہتے ہیں" ۔

نعیمہ خاتون نے اسی وقت ایک نوکر ناظر کسان کے پاس روانہ کر دیا اور اقبال کا ہاتھ پکڑ کر کہا "میرے اچھے اقبال! آج سے تم میرے بیٹے بن جاؤ ۔ کیا تم رضامند ہو؟"

اقبال نے جواب دیا "جی ہاں ۔ بیگم صاحبہ! بشرطیکہ میرے بوڑھے ماں باپ مجھ سے نہ چھینے جائیں" ۔

نعیمہ خاتون اقبال کا یہ بھولا بھالا جواب سن کر بہت مسرور ہوئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر اُس نے اپنے شوہر کو انور اور اقبال کی پوری داستان سنائی۔

جمال منزل میں اقبال کے مشاہدات

اقبال کی زندگی میں یہ ایک نئی بات تھی۔ اُس نے پہلے کبھی ایسے سجے ہوئے کمرے اور قیمتی اشیاء نہ دیکھی تھیں۔ ایک کمرہ میں قدِ آدم آئینہ رکھا ہوا تھا۔ اقبال وہاں گیا تو اُس کو بہت دھوکا ہوا۔ وُہ سمجھا کہ وہ کمرے بالکل ایک جیسے سجے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان جہاں آئینہ رکھا ہے دروازہ کھلتا ہے۔ اِسی طرح جب وہ ہال کمرے میں گیا تو اس کو بہت اچنبھا ہوا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز پر

چھ بڑے بڑے آئینے سیدھے کھڑے تھے۔ جب اقبال اس کمرہ
میں داخل ہوا تو اس کو ان آئینوں کے درمیان پانچ گلدستے
میز پر رکھے ہوئے نظر آئے۔ لیکن جب وہ گھوم کر دوسری طرف
گیا تو اس کو پانچ گلدستوں کی بجائے پانچ گھڑیاں نظر آئیں اور
آگے بڑھا تو گھڑیاں بھی غائب ہو گئیں اور اُن کی جگہ پانچ
تصویریں دکھائی دیں۔ پھر اس نے چاروں طرف گھوم کر اور
سب چیزوں کو اپنے ہاتھ سے چھو کر دیکھا تو آئینوں کے درمیان
صرف ایک گھڑی، ایک گلدستہ، ایک تصویر اور تین اور
چیزیں رکھی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اس کو بہت حیرت ہوئی کہ ایک
چیز کی بجائے پانچ پانچ چیزیں کیسے نظر آتی ہیں۔ لیکن اُس نے
اپنے دل میں کہا۔ "پروفیسر ابراہیم صاحب مجھ کو یہ ضرور
سمجھا سکیں گے" اس لئے وہ چپ چاپ دوسرے کمرہ میں
جہاں کھانا چنا ہوا تھا، چلا گیا۔

کھانے کی میز پر ایک سفید براق چادر بچھی ہوئی تھی۔
چادر کے اوپر شیشے کے گلاس اور چینی کے خوشنما برتن رکھے

نعیمہ خاتون اقبال کا یہ بھولا بھالا جواب سُن کر بہت مسرور ہوئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر اُس نے اپنے شوہر کو انور اور اقبال کی پوری داستان سُنائی ⁂

جمال منزل میں اقبال کے مشاہدات

اقبال کی زندگی میں یہ ایک نئی بات تھی۔ اُس نے پہلے کبھی ایسے سجے ہوئے کمرے اور قیمتی اشیاء نہ دیکھی تھیں ایک کمرہ میں قدِ آدم آئینہ رکھا ہوا تھا۔ اقبال وہاں گیا تو اُس کو بہت دھوکا ہوا۔ وہ سمجھا کہ دو کمرے بالکل ایک جیسے سجے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان جہاں آئینہ رکھا ہے دروازہ کھلتا ہے۔ اسی طرح جب وہ ہال کمرے میں گیا تو اس کو بہت اچنبھا ہوا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز پر

چھ بڑے بڑے آئینے سیدھے کھڑے تھے۔ جب اقبال اس کمرہ
میں داخل ہوا تو اس کو ان آئینوں کے درمیان پانچ گلدستے
میز پر رکھے ہوئے نظر آئے۔ لیکن جب وہ گھوم کر دوسری طرف
گیا تو اس کو پانچ گلدستوں کی بجائے پانچ گھڑیاں نظر آئیں اور
آگے بڑھا تو گھڑیاں بھی غائب ہو گئیں اور اُن کی جگہ پانچ
تصویریں دکھائی دیں۔ پھر اس نے چاروں طرف گھوم کر اور
سب چیزوں کو اپنے ہاتھ سے چھو کر دیکھا تو آئینوں کے درمیان
صرف ایک گھڑی، ایک گلدستہ، ایک تصویر اور تین اور
چیزیں رکھی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اس کو بہت حیرت ہوئی کہ ایک
چیز کی بجائے پانچ پانچ چیزیں کیسے نظر آتی ہیں لیکن اس نے
اپنے دل میں کہا۔ یہ وہ تیسرا بڑا بھید ہے جو مجھ کو یہ حضرت وہ
سمجھا سکیں گے۔ اس لئے وہ چپ چاپ دوسرے کمرہ میں
جہاں کھانا چنا ہوا تھا، چلا گیا۔

کھانے کی میز پر ایک سفید براق چادر بچھی ہوئی تھی۔
چادر کے اوپر شیشے کے گلاس اور چینی کے خوشنما برتن رکھے

تھے۔ بہت سے مہمان میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ جب اقبال اس کمرہ میں داخل ہوا تو نعیمہ نے اسے اپنے پاس ایک کرسی پر بٹھایا اور کھانے کے لئے اسے عمدہ عمدہ چیزیں غایت درجہ مہربانی اور شفقت کے ساتھ دیتی رہی۔ لیکن نعیمہ خاتون اور مہمانوں کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اقبال نہ تو کسی چیز کو خاص رغبت سے کھاتا تھا اور نہ سونے چاندی کے برتن دیکھ کر حیران نظر آتا تھا۔ نعیمہ خاتون خود بھی نفیس اور قیمتی اشیاء کی دلدادہ تھی اور اس کا انور بھی مرغن کھانوں اور زرق برق کپڑوں کا عاشق تھا۔ اس لئے ان چیزوں کی طرف اقبال کی عدم توجہ دیکھ کر اس کو بہت مایوسی ہوئی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ اقبال کے دل پر اس کی دولتمندی اور انور کی عمدہ عمدہ چیزوں کا رعب بیٹھ جائے لیکن اقبال کی نگاہ ان آرائشی چیزوں کی قدر شناس نہ تھی۔ اس کی نظروں میں یہ سب چیزیں غیر ضروری تھیں ؎

اقبال اور نعیمہ خاتون

کی دلچسپ گفتگو

آخر کار نعیمہ خاتون نے اقبال کو چاندی کے ایک چمکدار گلاس میں پانی پینے کو دیا ۔ گلاس کے باہر خوبصورت نقش و نگار تھے اقبال نے انہیں غور سے دیکھا تو نعیمہ خاتون نے خوش ہو کر کہا ۔ "اگر تم چاہو تو تم یہ گلاس لے سکتے ہو یہ گلاس انور کا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ انور تمہیں یہ خوشی سے دیگا" ۔

یہ سن کر انور نے کہا ۔ "امّاں جان ۔ میں نہایت خوشی سے یہ گلاس اپنے دوست کو دے سکتا ہوں ۔ کیونکہ میرے پاس اِس سے بھی زیادہ خوبصورت تین گلاس اور ہیں ۔ ایک تو سونے کا ہے اور دو چاندی کے ہیں" ۔

ننھے اقبال نے ہنس کر کہا ۔ "میں آپ کا مشکور یہ عرض

کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ گلاس آپ سے لینا نہیں چاہتا کیونکہ میرے پاس گھر پر اس سے بہتر گلاس موجود ہے"۔

نعیمہ خاتون نے حیران ہو کر پوچھا "کیا تمہارے ماں باپ کے پاس سونے چاندی کے برتن ہیں؟"

اقبال نے سوچ کر جواب دیا "بیگم صاحبہ مجھے ٹھیک معلوم نہیں لیکن عام طور پر ہم مٹی کے آبخوروں میں پانی پیتے ہیں"۔

نعیمہ خاتون نے اپنے مہمانوں کی طرف دیکھ کر کہا "میرا خیال ہے کہ یہ بچے ابھی نا سمجھ ہیں"۔

پھر اس نے اقبال کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم نے مٹی کے آبخورے کو ہمارے چاندی کے گلاس سے بہتر کیوں سمجھا ہے؟"

اقبال - "اس لئے کہ وہ ہمیں کچھ تکلیف نہیں دیتا"۔

نعیمہ خاتون نے جھلا کر کہا "تکلیف دینے سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

اقبال ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارا آبخورہ ہاتھ سے گر
پڑتا ہے تو ہم بے چین نہیں ہوتے بلکہ اگر وہ ٹوٹ بھی جائے
تو ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی ۔ ہم نیا آبخورہ خرید لیتے ہیں
لیکن جب آپ کے نوکر کے ہاتھ سے یہ برتن گر پڑے تھے
تو آپ بہت خفا ہوئی تھیں ۔ آپ کو ضرور بہت رنج ہوا ہوگا"
نعیمہ خاتون نے پھر جھلا کر کہا "بچے ۔ تم کیسی باتیں کرتے
ہو ؟"

بات یہ ہوئی تھی کہ باورچی خانہ سے کھانا لاتے ہوئے
ایک نوکر کے ہاتھ سے چند برتن زمین پر گر پڑے تھے ۔ اور
نعیمہ خاتون نے اس نوکر کو بہت کچھ سخت سست کہا تھا
اور برا بھلا کہنے کے علاوہ جرمانہ کی دھمکی بھی دی تھی ۔
کھانا ختم ہونے کے بعد نعیمہ خاتون نے شربت کا ایک
گلاس اقبال کو دیا اور کہا "اسے پی جاؤ ۔ یہ بہت مفرح
شربت ہے" لیکن اقبال نے شکریہ ادا کر کے گلاس میز پر
رکھ دیا اور کہا "مجھے پیاس نہیں ہے" اس پر نعیمہ خاتون

نے اِسے دوبارہ پیار سے کہا ۔ "تم بہت پیارے بچّے ہو۔ یہ بہت شیریں اور خوش گوار شربت ہے۔ اِسے میری خاطر ضرُور پی لو" ۔

اقبال نے جواب دیا " لیکن بیگم صاحبہ ۔ میں اسے کیسے پی سکتا ہوں ؟ میں بالکل پیاسا نہیں ہوں ۔ مجھے پروفیسر ابراہیم صاحب نے بتایا ہوا ہے کہ ہمیں صرف اس وقت کچھ پینا چاہیئے جب ہمیں پیاس ہو اور اس وقت کچھ کھانا چاہیئے جب ہمیں بھوک ہو۔ اُنھوں نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ ہمیں صرف ایسی چیزیں کھانی پینی چاہئیں جو آسانی سے مِل سکتی ہیں ورنہ ہماری عادت بگڑ جائے گی ۔ جب ہمیں عمدہ چیزیں کھانے پینے کے لئے نہیں ملیں گی تو ہمیں بہت تکلیف ہو گی ۔ حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلّم اور اُن کے صحابہ کرام ہمیشہ ایسا ہی کرتے تھے اور وہ بہت نیک بندے تھے " ۔

میرزا جمال چھوٹے سے مُنہ سے یہ سچّی بات سن کر بہت خوش ہوئے ۔ اُنھوں نے کہا " میاں اقبال ۔ کیا تم اِن نیک

لوگوں کو جانتے ہو ؟"

اقبال ۔"جی ہاں، جناب ۔ میں نے ان کے حالات پروفیسر صاحب سے سُنے ہیں" ۔

میرزا صاحب ۔" اچھا میاں، ہم بھی سُنیں، تمہیں ان لوگوں کے حالات کیا معلوم ہیں ؟ "

نیک لوگوں کے حالات

آج سے تقریباً تیرہ سو برس پہلے، دُنیا میں جہالت اور بدکاری کا دَور دورہ تھا ۔ سب لوگ اللہ کو بھُولے ہوئے تھے ۔ امیر غریبوں پر ظلم کرتے تھے اور غربا محنت مزدوری کرنے کی بجائے بیکار رہنا پسند کرتے تھے ۔ اُس زمانہ میں ملک عرب کی حالت بہت ہی خراب تھی ۔ وہاں کے لوگ ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے ۔ بیٹیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیتے تھے ۔

بُتوں کو پُوجتے تھے اور اللہ کو بالکل نہیں مانتے تھے۔ عرب کی ردّی حالت کے متعلق مجھے چند شعر یاد ہیں ؎

کہیں آگ پُجتی تھی واں بے محابا
کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا
بہت سے تھے تثلیث پر دل سے شیدا
بُتوں کا عمل سو بسو جا بجا تھا
کرشموں کے راہب کا تھا صید کوئی
طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی
چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے
نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اَڑ بیٹھتے تھے

سلجھتے نہ تھے جب جھگڑے بیٹھے تھے

جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے

تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے

بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا

تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی

صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی

قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی

تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

نہ جھگڑا کوئی مال و دولت کا تھا وہ

کرشمہ اِک اُن کی جہالت کا تھا وہ

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا

کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا

لبِ جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا

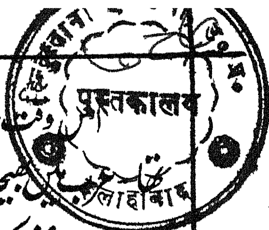
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یونہیں روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یونہیں چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اُس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جُو ا اُن کے دن رات کی دل لگی تھی
شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی
غرض ہر طرح اُن کی حالت بُری تھی
بہت اس طرح اُن کی گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

(مسدس حالی)



[illegible] وقت خدا نے اپنا ایک نیک بندہ جس کا نام محمدؐ عرب میں بھیجا۔ آپؐ نے لوگوں کو نیکی کا راستہ بتایا، بُرے کاموں سے منع کیا اور خدا کی عبادت سکھائی۔ شروع شروع میں لوگوں نے آپ کو بہت ستایا اور جان سے مار ڈالنا چاہا۔ لیکن وہ اللہ کا بندہ وعظ و نصیحت سے باز نہ آیا۔ رفتہ رفتہ بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہ لوگ صحابہؓ کرام کہلاتے ہیں۔ حضرت محمدؐ صاحب اور اُن کے صحابہؓ کرام بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں عمدہ چیزیں کھانے کا شوق نہ تھا۔ وہ جَو کی روٹی اور کھجوروں پر گذارہ کرتے تھے۔ حضرتؐ صاحب لوگوں سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ وہ سب کو نیک کام کرنے اور اللہ کو ایک ماننے کی تاکید فرماتے تھے۔ اُن کے دشمنوں نے اُنہیں مکّہ سے نکال دیا۔ آپؐ مدینہ ہجرت کر گئے اور وہاں کے سب لوگ مسلمان ہو گئے۔ چند برسوں کے بعد آپ نے مکّہ فتح کر لیا اور پھر تمام عرب مسلمان ہو گیا۔ حضرت محمدؐ صاحب کی شان میں مجھے چند اشعار یاد ہیں جو میں پڑھ کر آپ کو سناتا

ہوں :-

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماوے
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولے
خطاکار سے درگذر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر
تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر

گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور
سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ "اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب"
کہا سب نے "قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سُنا اور نہ دیکھا"
کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا
تو باور کروگے اگر میں کہونگا؟
کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پاکر
کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے"
کہا "گر مری بات یہ دل نشیں ہے
تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے
کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمین جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دِل میں سب کے لگا دی
اِک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غُل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نام حق سے

(مسدسِ حالی)

حضرت محمدؐ صاحب کی وفات کے بعد آپؐ کے صحابہ کرام نے چار دانگ عالم میں نیکی کا وعظ پھیلایا اور دُور دُور دراز ممالک کو فتح کیا۔ گو یہ نیک لوگ دنیا کے بادشاہ ہو گئے تھے تاہم وہ سادہ غذا کھاتے اور سادہ لباس پہنتے تھے۔ تھوڑی سی کھجوریں کھا کر اور پانی کے چند گھونٹ پی کر اللہ تعالےٰ کا شکر بجا لاتے تھے۔

سب اسلام کے حکم بردار بندے سب اسلامیوں کے مددگار بندے

خدا اور نبیؐ کے وفادار بندے — یتیموں کے رانڈوں کے غمخوار بندے
رہِ کفر و باطل سے بیزار سارے
نشے میں مئے حق کے سرشار سارے
جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے — کہانت کی بنیاد ڈھا دینے والے
ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

(مسدس حالی)

یہ نیک لوگ بہت مضبوط، جفاکش اور مستعد تھے۔ جب تک اِن میں نیکی اور سادگی کی عادات باقی رہیں وُہ دُنیا کے حاکم بنے رہے۔ لیکن جب اس کے بعد، مسلمان عمدہ عمدہ کھانوں اور تکلّفات کے عادی ہو گئے تو اُن کی حالت خراب ہو گئی۔ اُنھوں نے نیکی کے کام چھوڑ دیئے اور اللہ اُن سے ناراض ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اللہ کا ملک اُن کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اور وُہ دوسروں کے ماتحت ہو گئے۔ آج یہ حالت ہے۔ کہ مسلمانوں کی اکثر سلطنتیں تباہ ہو گئی ہیں اور دُنیا میں وُہ

ذلّت کے ساتھ رہ رہے ہیں"۔

اقبال کی یہ تقریر سن کر میرزا صاحب دنگ رہ گئے۔
اُنھوں نے کہا "واللہ! یہ چھوٹا سا بچّہ تو اچھا خاصہ عالم ہے
اگر پروفیسر ابراہیم صاحب کے فیضانِ صحبت سے ہمارا انور
بھی ایسا لائق ہوجائے تو ہم اُن کے بہت مشکور رہوں گے
کہو انور کیا تم بھی اقبال کی طرح عالم فاضل بننا چاہتے ہو؟"
انور:۔ ابّا جان! میں نہیں جانتا کہ عالم کیا ہوتا ہے۔ میں
بادشاہ بننا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وُہ سب سے زیادہ امیر ہوتا
ہے۔ اسے کچھ کام کاج نہیں کرنا پڑتا بلکہ لوگ اس کی خدمت
کے لئے تیار رہتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں"۔

نعیمہ نے کہا "شاباش" اور اُٹھ کر انور کا منہ چوم لیا۔
"تم واقعی بادشاہ بننے کے قابل ہو۔ اقبال کیا تم بھی بادشاہ
بننا چاہتے ہو؟"

اقبال:۔ بیگم صاحبہ۔ میں بادشاہت کا متمنی نہیں ہوں۔
میں اُمید کرتا ہوں کہ تھوڑے عرصہ میں میں بڑا ہو کر ہل چلانے

کے قابل ہو جاؤں گا اور اپنے لئے اناج پیدا کر سکوں گا۔ پھر مجھے کسی نوکری کی ضرورت نہ ہو گی"۔

نعیمہ نے اقبال کی طرف حقارت سے دیکھا اور اپنے خاوند کے کان میں کہا "دہقانوں اور شرفائ کے بچوں میں کس قدر فرق ہوتا ہے"۔

میرزا صاحب نے جواب دیا "میں نہیں کہہ سکتا کہ دونو بچوں میں سے کس کا جواب بہتر ہے" پھر اُنہوں نے اقبال کی طرف مُڑ کر کہا "کیوں میاں اقبال کیا تم امیر ہونا بھی پسند نہیں کرتے؟"

اقبال"۔ نہیں جناب بالکل نہیں۔ کیونکہ میں نے آج تک صرف ایک ہی امیر آدمی دیکھا ہے۔ ہمارے پڑوس میں نواب اعظم یار جنگ صاحب رہتے ہیں وہ لوگوں کے کھیتوں میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہیں، اُن کی باڑیں توڑ ڈالتے ہیں۔ اُن کے کبوتروں کو گولی کا نشانہ بناتے ہیں، اُن کے مال مویشی زخمی کر دیتے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ ناحق بیچارے

دہقانوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں۔ نواب صاحب ایسے بُرے کام اِس لئے کرتے ہیں کہ وہ امیر ہیں۔ سب آدمی اُن سے نفرت کرتے ہیں اور انہیں بُرا سمجھتے ہیں لیکن میں ہرگز پسند نہیں کرتا کہ لوگ مجھ سے نفرت کریں"۔

نعیمہ یہ باتیں سُن کر بہت خفا ہوئی۔ لیکن اُس نے اپنے غصّہ کو روک کر کہا "اچھا! کیا تم ایک خوبصورت کوٹ سیر کے لئے گاڑی، اور خدمت گذاری کے لئے نوکر چاکر بھی نہیں چاہتے؟"

اقبال:- "بیگم صاحبہ! مجھے ریشمی کپڑوں کی مطلقاً کچھ ضرورت نہیں۔ کپڑے انسان، ستر پوشی اور بدن کی حفاظت کے لئے پہنتا ہے۔ ظاہری زیبائش کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ اپنے ملک کا بنا ہوا کپڑا ہماری کل ضروریات کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ کھدر یا زیادہ سے زیادہ سودیشی کپڑا، جو دیسی سوت سے ہندوستانی کارخانوں میں تیار ہوتا ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے بہترین لباس ہے۔ کھدر پوشی سے نوابوں اور امیروں

کو بھی کچھ عار نہیں ہونی چاہیئے۔ ہندوستان کی اقتصادی آزادی کھدر کے عالمگیر استعمال میں مضمر ہے۔ سوراج کا بنیادی پتھر کھدر ہے۔ مجھے کھدر بہت محبوب ہے۔ کھدر کا کوٹ میری نظروں میں ریشمی کوٹ سے بدرجہا بہتر ہے نہ مجھے گاڑی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ میں جہاں چاہتا ہوں، پیدل چل کر جا سکتا ہوں اور جب میں اپنے کام خود کر سکتا ہوں تو پھر مجھے نوکروں کی احتیاج نہیں ہے"۔

نعیمہ خاتون یہ باتیں سن کر اور زیادہ برافروختہ ہوئیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے اقبال سے کوئی اور سوال نہ پوچھا۔ شام کے وقت اقبال اپنے گھر واپس گیا۔ اس کے باپ نے اس سے پوچھا "اقبال۔ جمال منزل میں تم نے کیا کچھ دیکھا؟ کیا تم وہاں خوش رہے؟"

اقبال ۔ وہاں سب لوگ میرے ساتھ مہربانی سے پیش آئے جس کے لئے میں ان کا مشکور ہوں۔ لیکن جتنی تکلیف آج مجھے کھانا کھاتے ہوئی، گھر پر کبھی نہیں ہوئی۔ ایک نوکر

میرے آگے سے برتن اُٹھاتا تھا۔ دوسرا پانی پیش کرتا تھا' تیسرا کھانا لاتا تھا' چوتھا میری کرسی کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ گویا میں اپاہج ہوں اور اپنا کام آپ نہیں کر سکتا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد مجھے دو گھنٹہ ایک ہی جگہ بیکار بیٹھنا پڑا۔ نعیمہ خاتون مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ لیکن اُن کی اور پروفیسر صاحب کی باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے وہ چاہتی تھیں کہ میں ریشمی کپڑوں کا دلدادہ اور امیر ہونے کا خواہشمند بنوں۔ لیکن مجھے یہ پسند نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ سب لوگ نواب اعظم یار جنگ کی طرح مجھ سے بھی نفرت کریں"۔

انور کی تعلیم کی تجویز

جمال منزل سے اقبال کے چلے آنے کے بعد میرزا صاحب اور نعیمہ خاتون میں حسب ذیل باتیں ہوئیں :۔

نعیمہ خاتون: "میں تسلیم کرتی ہوں کہ اقبال ایک نیک اور من چلا لڑکا ہے۔ وہ ہمارے انور سے زیادہ چست و چالاک ہے لیکن اس کے خیالات بہت پست ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کے ہوتے ہیں"۔

میرزا جمال بیگ: "یہ آپ کی سراسر زیادتی ہے میں نے آج تک ایسا سمجھ دار اور خوش مذاق لڑکا نہیں دیکھا اس بات کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ کسان کا لڑکا ہے امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت بہت عمدہ ہوئی ہے اس کی طبیعت کی افتاد بہت اچھی اور شریفانہ ہے۔ جن باتوں پر امیر لوگ فخر کرتے ہیں وہ ظاہری اور سطحی ہوتی ہے اصل چیز دل کی شرافت ہے نہ کہ فاخرہ لباس اور دولتمندی شریف آدمی دراصل وہی ہوتا ہے۔ جس کے اخلاق وسیع ہوں۔ جس کے خیالات بلند ہوں اور جو باہمت ہو۔ کسی خاص وضع کا لباس پہننے یا خاص انداز سے بات چیت کرنے سے انسان شریف نہیں بن

سکتا۔ سچّی شرافت انسان کا ایک ذاتی وصف ہے۔ جس کا تعلق اُس کے لباس یا ثروت کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوتا اِس لئے میں آپ سے کہتا ہوں کہ اِس کسان کے لڑکے کے دل میں سچّی شرافت کا بیج بویا جا چکا ہے۔ بڑا ہو کر ضرور وُہ ایک نیکوکار شریف آدمی ہو گا۔ اس کا دل سچّی شرافت سے لبریز اور اس کا دماغ علم وحکمت کا گنجینہ ہو گا۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرا بیٹا بھی کسی حیثیت سے اس کسان زادہ سے کم نہ رہے"۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ نعیمہ خاتون اپنے خاوند کی باتوں سے متفق تھی یا نہیں لیکن میرزا صاحب نے اس کے جواب کا اِنتظار کئے بغیر سلسلہ کلام یوں جاری رکھا:۔

"اگر میں آپ کو اس بارہ میں غیر معمولی جوش کے ساتھ گفتگو کرتا معلوم ہوں تو آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ میں تہِ دِل سے انور کی بہتری کا خواہاں ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم دونوں کے بیجا لاڈ پیار نے اس کی ترقّی مسدود کر دی ہے۔ اُس کی تربیت

ناقص ہے۔ لکھنا پڑھنا اِسے نام کو نہیں آتا۔ وہ چڑچڑا اور حد سے نازک اور نخریلا ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنی عمر کے مطابق خاطر خواہ ترقی نہیں کی، اور اس نے لکھنا پڑھنا اور دُوسری پسندیدہ عادات بالکل نہیں سیکھیں۔ انور کی محبّت اور تمہارا پاسِ خاطر آج تک مجھے اِن خیالات کے اظہار سے روکتا رہا لیکن آج اِس کی حقیقی بہبودی کے خیال نے باقی تمام خیالات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ میں نے مجبور ہو کر اس کی اصلاح کے لئے ایک تجویز سوچی ہے مجھے اُمید ہے کہ وہ آپ کو بھی ناپسند نہ ہوگی۔ تجویز یہ ہے کہ ہم کچھ عرصہ کے لئے انور کو پروفیسر ابراہیم کے سپرد کر دیں۔ بشرطیکہ وہ بطیبِ خاطر اُس کو اپنی زیرِ نگرانی لے لیں۔ میرا خیال ہے کہ اقبال کی ملاقات ہمارے انور کے لئے بہت مُفید اور نافع ثابت ہوگی۔ میں ناظر کسان سے کہوں گا کہ چند برسوں کے لئے اس کا بیٹا میرے خرچ پر پروفیسر ابراہیم کے پاس ٹھہرے تاکہ وہ اور ہمارا انور دونو اکٹھے پڑھ سکیں“۔

چونکہ یہ تجویز میرزا صاحب نے مستقل مزاجی کے ساتھ پیش کی تھی۔ اس لئے نعیمہ خاتون کو اس کے خلاف اعتراض کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے اسے بطیبِ خاطر منظور کر لیا۔ حالانکہ اسے انور سے جُدا ہونا قطعاً گوارا نہ تھا۔ جو شوہر خود کم حوصلہ اور کمزور ہوتے ہیں وہ اپنی بیویوں سے دب جاتے ہیں۔ اولاد کی ناقص تعلیم و تربیت اور گھروں کے ناقص انتظام کے لئے، موردِ الزام صرف مستورات نہیں ہوتیں بلکہ مرد بھی ہوتے ہیں جو مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے گھروں میں اصلاح کرنے کے ناقابل ہوتے ہیں۔ عورتیں ناقصات العقل سہی۔ لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ وُہ بلا کی معقول پسند ہوتی ہیں بشرطیکہ مرد ان کے سامنے قولِ شدید پیش کریں مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں اور باندازِ مناسب مسئلہ کے مالہ و ما علیہ ان پر بخوبی واضح کر دیں۔ نعیمہ خاتون ضدن ضرور تھی لیکن جب میرزا صاحب نے جی کڑا کر کے انور کی بہبودی کی تجویز پیش کی تو وہی نعیمہ خاتون اپنے دِل پر صبر کا پتھر رکھ

کر اپنے اکلوتے بیٹے کی جُدائی پر رضامند ہو گئی۔ چنانچہ میرزا صاحب نے آئندہ جمعہ کے دن پروفیسر ابراہیم صاحب کو مدعو کیا اور ان کے سامنے مناسب طریقہ سے اپنی تجویز پیش کی۔

"میں اپنی استعداد کے مطابق آپ کی خدمت کرنے اور ہر ایک قسم کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے بطیبِ خاطر حاضر ہوں۔ لیکن میں اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کو ایسا اہم اور ضروری خیال کرتا ہوں کہ ہر ایک قسم کا معاوضہ ادا کرنے کے باوجود میں ہمیشہ آپ کا مرہونِ منّت اور شکر گذار رہوں گا"۔

پروفیسر صاحب نے جواب دیا "آپ کا قطع کلام کرنے کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ میں چند ماہ کے لیئے آپ کے بیٹے کو اپنی زیرِ نگرانی رکھنے کے لئے بخوشی تیار ہوں۔ میں حتّی الامکان اس کی اصلاح کی کوشش کرونگا۔ لیکن ایک لابدی شرط یہ ہے کہ آپ مجھے بہ حیثیت ایک دوست کے اپنی خدمت کا موقع دیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ مجھے کسی قسم کے معاوضہ کی ضرورت نہیں ہے۔ انور کی اصلاح اور صحیح تعلیم و تربیت میرے لئے

کچھ کم معاوضہ نہ ہوگا - اگر آپ میرے خیالات اور طرزِ تعلیم سے متفق ہوں گے تو جب تک آپ چاہیں گے - میں انور کو اپنے پاس بخوشی رکھوں گا - سرِ دست میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ابتداءً مجھے ایک اتالیق سے زیادہ اختیارات بحیثیت دوست تفویض کئے جائیں - تاکہ میں اِن نقائص کی جو حد سے زیادہ لاڈ پیار اور بیجا شفقت سے انور کے مزاج میں پیدا ہو گئے ہیں - خاطر خواہ اصلاح کے قابل ہو سکوں" ؛

گو یہ تجویز بڑا امیر آدمی کے لئے بہت غیر مرغوب تھی - تاہم اِسے ماننے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا - چنانچہ اگلی صبح کو ننھا انور پروفیسر صاحب کی کوٹھی پر، جو جمال منزل سے چند میل کے فاصلہ پر تھی بھیج دیا گیا ؛

انور کی تعلیم شروع ہوتی ہے

جس روز انور پروفیسر ابراہیم صاحب کے ہاں پہنچا۔ اُس سے ایک روز قبل اقبال بھی وہاں آگیا تھا۔ اگلے دن ناشتہ کے بعد پروفیسر صاحب دونوں بچّوں کو باغ میں لے گئے۔ وہاں جاکر اُنہوں نے ایک پھاوڑا اپنے ہاتھ میں لے کر اور ایک بیلچہ اقبال کو دے کر بڑی مستعدی سے کام کرنا شروع کر دیا اور کہا "لازم ہے کہ ہر ایک آدمی، جو اناج کھاتا ہے، غلّہ کی پیداوار میں بالواسطہ یا بلا واسطہ مدد دے۔ ہم یہاں بسہولت اناج پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے اقبال اور میں روزانہ یہ کام کرتے ہیں یہ میری کیاری ہے اور وہ اس کی، ہم میں سے جو کوئی زیادہ اناج پیدا کرے گا۔ اُسی کا کام بہتر سمجھا جائیگا۔ میاں انور اگر تم ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا چاہو تو میں ایک کیاری تمہیں بھی الگ کر دونگا۔ جو بالکل تمہاری ہوگی اور جس کی پیداوار

کے تم ہی مالک ہو گے ۔ انور نے رنجیدہ ہو کر کہا ۔ "نہیں جناب ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور میں ایک مزدور کی طرح پسینہ بہانا نہیں چاہتا" ۔

پروفیسر صاحب نے جواب دیا "بہت اچھا مسٹر شریف آدمی ۔ مجھے اور اقبال کو مفید بننے سے عار نہیں ہے خواہ تم ہمیں مزدور کیوں نہ سمجھو ۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کرتے جو تمہاری خوشی میں آئے کرو، ہم اب کھدائی کا کام شروع کرتے ہیں" ۔

دو گھنٹے کے بعد پروفیسر صاحب نے کہا "اب کام ختم کرنا چاہیئے" اور اقبال کا ہاتھ پکڑ کر اسے نہایت پیار سے گھر میں لے گئے اور انگور کی بیل سے ایک خوشہ توڑ کر آپس میں بانٹ لیا ۔ انور بھی اُن کے پیچھے پیچھے کمرہ میں چلا گیا اور اپنے حصہ کے لئے منتظر کھڑا رہا ۔ جب اُس نے دیکھا کہ اس کی پرواہ کئے بغیر دونوں نے انگور کھانا شروع کر دیا تو وہ ضبط نہ کر سکا ۔ اور اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا ۔

پروفیسر صاحب نے نہایت متانت کے ساتھ کہا "کیا

بات ہے؟" انور نے بُرا منہ بنا کر اُن کی طرف دیکھا۔ لیکن کچھ جواب نہ دیا۔ اِس پر اُنہوں نے مسکرا کر کہا "بہت اچھا صاحب۔ اگر تم جواب دینا پسند نہیں کرتے تو نہ سہی۔ ہم یہاں کسی کو بولنے پر مجبور نہیں کرتے"۔

یہ سُن کر انور اور زیادہ رنجیدہ ہوا اور غصّہ کے مارے گھر سے باہر دوڑ گیا۔ بیچارہ بہت حیران تھا کہ یہاں کسی کو میری پرواہ نہیں ہے۔

انگور ختم ہو گئے تو اقبال نے پروفیسر صاحب سے کہا "جب ہم باغ میں کام کر رہے تھے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے ایک دلچسپ کہانی پڑھنے کے لئے دیں گے"۔

پروفیسر صاحب "بہت اچھا۔ مکھیوں اور چیونٹیوں کی ایک دلچسپ کہانی اِس کتاب میں درج ہے۔ اِسے پڑھو۔ لیکن اِس امر کی تاکید ہے کہ آہستہ آہستہ اور صاف صاف پڑھو اور کوشش کرو کہ جو کچھ پڑھو۔ سمجھ کر پڑھو"۔

اقبال نے کتاب اُٹھا کر یوں پڑھنا شروع کیا:۔

مکھیوں اور چیونٹیوں کی کہانی

ایک باغ میں بہت سی چیونٹیاں رہتی تھیں یہ چیونٹیاں موسم گرما میں سارا دن دانا دُنکا اور چھوٹے چھوٹے بیج اپنے بل کے اندر لے جانے میں مصروف رہتی تھیں۔ اُن کے پاس ہی پھولوں کی ایک کیاری تھی۔ جس پر بہت سی مکھیاں بھنبھناتی اور کھیلتی رہتی تھیں اور سارا دن ایک پھول سے دُوسرے پھول پر اُڑ کر اپنا دِل خوش کرتی رہتی تھیں۔ ایک چھوٹا نادان لڑکا اِن جانوروں کی مختلف عادات کو اکثر غور سے دیکھتا رہتا تھا۔ ایک دِن اُس نے حیران ہو کر کہا "کوئی جانور اِن چیونٹیوں سے زیادہ بیوقوف نہیں ہو سکتا۔ یہ دن بھر محنت مشقّت کرتی رہتی ہیں اور اِن مکھیوں کی طرح اپنا دل نہیں

بہلاتیں"۔ اِس کے بعد جب کڑاکے کی سردی شروع ہوئی تو ایک دن وہی لڑکا باغ میں آیا۔ اُسے کوئی چیونٹی نظر نہ آئی۔ لیکن بہت سی مکھیاں اِدھر اُدھر زمین پر مری ہوئی دکھائی دیں، چونکہ وُہ ایک رحم دل بچہ تھا، اس کو اِن بدقسمت مکھیوں پر بہت ترس آیا۔ چنانچہ اُس نے اپنے باپ سے پُوچھا "یہ مکھیاں کیوں مری پڑی ہیں؟ اور چیونٹیاں کہاں گئی ہیں؟" باپ نے جواب دیا "چونکہ مکھیاں کام نہیں کرتی تھیں اور سردی کے لئے اُنہوں نے ذخیرہ جمع نہیں کیا تھا۔ اِس لئے وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر گئی ہیں۔ برعکس اِس کے چیونٹیاں اپنے بلوں میں آرام کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ اُنہوں نے گرمیوں میں اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے سردیوں کے لئے ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ جب سردی کم ہو جائے گی وہ اپنے بلوں میں سے نکل آئیں گی"۔

جب اقبال یہ کہانی پڑھ چکا تو پروفیسر صاحب اِسے سیر کے لئے باہر لے گئے اور دیر تک کھیتوں میں سیر کراتے رہے وہاں اُنہوں نے اقبال کو بہت سے پودوں کے نام بتائے

اور ان کے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ اقبال نے پروفیسر صاحب کی باتیں غور سے سنیں اور کہا "جناب۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ اگر آپ مجھے اسی طرح پڑھاتے رہینگے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ میں سب درختوں اور جڑی بوٹیوں کے نام اور خواص بہت جلد سیکھ جاؤں گا"۔

جب وہ گھر واپس آرہے تھے تو اقبال نے دیکھا کہ ایک چیل ایک چوزے کو پھاڑ رہی ہے۔ اقبال کو معلوم تھا کہ چیل ایک گوشت خور جانور ہے۔ اس لئے وہ چلّا کر اُس کی طرف جھپٹا۔ چیل ڈر کر اُڑ گئی اور زخمی چوزے کو وہیں چھوڑ گئی۔ اقبال نے کہا "دیکھئے جناب، ظالم جانور نے اس بیچارے کو کیسا ادھموا کر دیا ہے۔ بیچارے نے اپنے پر و بازو کس طرح نیچے لٹکا دیئے ہیں۔ میں اسے اپنے سینہ سے لگا کر گرم کروں گا اور گھر لیجاؤنگا جب تک یہ تندرست اور روانہ دانہ کھانے کے قابل نہیں ہو جائے گا۔ میں اسے اپنے کھانے میں سے حصہ دیا کروں گا" گھر پہنچ کر اقبال نے زخمی چوزے کو پانی پلایا اور ایک ٹوکری

میں تھوڑی سی بھس ڈال کر آرام سے لٹا دیا - پھر وہ اور پروفیسر صاحب کھانے کے کمرہ میں گئے ۔

انور کا پہلا سبق

انور تھک کر گھر میں لوٹ آیا تھا اور اس کو تیز بھوک لگی ہوئی تھی - اس لئے جب پروفیسر صاحب اور اقبال کھانا کھانے بیٹھے تو وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گیا - لیکن پروفیسر صاحب نے اسے مخاطب کر کے کہا "جناب آپ ایک شریف آدمی ہیں اور کام کرنا پسند نہیں کرتے - بلکہ کام کرنے کو برا سمجھتے ہیں اس لئے ہم بھی آپ کو محنت مزدوری کر کے کھلانا نہیں چاہتے" ۔

یہ سچی بات سن کر انور ایک کونے میں دبک کر جا بیٹھا اور رونا شروع کر دیا - اسے بھوکے رہنے کی بہ نسبت اس بات کا غصہ زیادہ تھا کہ کسی کو بھی اس کے رونے کی پرواہ نہ تھی -

اقبال اپنے دوست کا اِس طرح رونا برداشت نہ کر سکا
اِس لئے اُس نے پروفیسر صاحب کو کہا :-
"جناب عالی! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اپنے حِصّہ کو جس
طرح چاہوں بانٹ سکتا ہوں"۔

پروفیسر صاحب - "یقیناً"

اقبال - "بہت خوب - میں اپنا حِصّہ سارے کا سارا،
انور کو جس کی ضرورت مجھ سے زیادہ ہے دیتا ہوں"۔

یہ کہہ کر اقبال اپنا حِصّہ انور کے پاس لے گیا - انور نے
اس کا شکریہ ادا کیا اور جھٹ پٹ کھانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ
کر پروفیسر صاحب نے کہا "خوب - میں اب سمجھا - اگرچہ شریف
آدمی اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کرنا بُرا سمجھتے ہیں۔ تاہم وہ دُوسرے
لوگوں سے جو محنت کر کے اور پسینہ بہا کر غلّہ پیدا کرتے ہیں،
مُفت روٹی لے کر کھانے میں عار نہیں سمجھتے" یہ سُن کر انور اور
زیادہ زور سے رویا - لیکن بھُوک کا غلبہ تھا - رونے کے باوجود
کھانا بھی کھاتا گیا۔

دوسرے دن پروفیسر صاحب اور اقبال، حسبِ معمول صبح سویرے باغ میں کام کرنے کے لئے گئے۔ ابھی اُنہوں نے کام شروع ہی کیا تھا کہ انور وہاں پہنچ گیا اور ایک کھرپا مانگ کر اس نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ اُس نے پہلے کبھی ایسا کام نہ کیا تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنی ٹانگوں پر کئی زخم لگائے یہ دیکھ کر پروفیسر صاحب نے اپنا پھاوڑا زمین پر رکھ دیا اور انور کو کام کرنا سکھایا۔ تھوڑی دیر میں، وہ پروفیسر صاحب کی مدد اور اپنے شوق سے بہت کچھ سیکھ گیا اور خوشی خوشی کام کرتا رہا۔ جب کام ختم ہو گیا تو تینوں گھر میں گئے۔ ناشتہ کے وقت جب انور کو بھی حصّہ مِلا تو اس کو بے اندازہ خوشی ہوئی۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ ایسا لذیذ ناشتہ میں نے پہلے کبھی نہیں کھایا اس کی وجہ یہ تھی کہ کھُلی ہوا میں کام کرنے سے اسے اشتہائے صادق پیدا ہو گئی تھی اور بھوک بہترین چٹنی ہے۔

جب ناشتہ ہو چکا تو پروفیسر صاحب نے ایک کتاب نکالی اور انور سے کہا "اِس میں سے ایک کہانی پڑھو" لیکن

انور نے شرمسار ہو کر جواب دیا "مجھے پڑھنا نہیں آتا" پروفیسر صاحب نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہیں" پھر انہوں نے اقبال کو پڑھنے کے لئے فرمایا۔ چنانچہ اقبال نے مندرجہ ذیل کہانی پڑھی :-

ایک امیر آدمی اور مزدور کی کہانی

ایک شہر میں ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ اُس کا تمام وقت کھانے پینے سونے اور تفریحِ طبع میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے بہت سے نوکر تھے وہ بہت مغرور تھا اور سمجھتا تھا کہ کل دنیا اس کی تابعدار ہے اور غریب لوگ صرف خدمت کرنے اور کہا ماننے کے لئے پیدا ہوئے ہیں ۔

اس امیر آدمی کی حویلی کے پاس ہی ایک غریب مزدور
رہتا تھا جو ٹوکریاں بنا کر اپنا پیٹ پالتا تھا - وہ صبح سے شام
تک محنت کرتا تھا - اِسے خشک روٹی یا اُبلے ہوئے چاولوں
سے بہتر کوئی غذا نہ ملتی تھی اور گو وُہ زمین پر سوتا تھا تاہم وہ ہمیشہ
خوش باش اور قانع رہتا تھا - ہاتھ پاؤں ہلانے سے اِسے بھوک
خوب لگتی تھی - اور موٹی جھوٹی روٹی بہت مزا دے جاتی تھی -
جب وُہ کام کرنے سے تھک جاتا تو اسے بہت میٹھی نیند آتی
تھی - برخلاف اِس کے امیر آدمی کو اپنی نرم سیج پر بھی چین سے
نیند نہیں آتی تھی کیونکہ وُہ تمام دن بیکار رہتا تھا - وہ ورزش
یا سیر وغیرہ کچھ نہیں کرتا تھا - اس لئے اُسے عُمدہ عُمدہ کھانے بھی بدمزہ
معلوم ہوتے تھے - اُسے کبھی اشتہائے صادق پیدا نہیں ہوتی
تھی - لیکن بھوک نہ ہونے کے باوجود وہ چٹنی - مربّے اور دیگر
لذیذ اشیاء پیٹ بھر کر کھا جاتا تھا - اِس لئے وہ ہمیشہ بیمار
رہتا تھا - چونکہ وُہ کسی کے ساتھ نیک سلوک نہیں کرتا تھا -
اِس لئے درحقیقت اُس کا کوئی دوست نہ تھا - اُس کے نوکر

مکھیوں اور چیونٹیوں کی کہانی

ایک باغ میں بہت سی چیونٹیاں رہتی تھیں یہ چیونٹیاں موسم گرما میں سارا دن دانا دنکا اور چھوٹے چھوٹے بیج اپنے بل کے اندر لے جانے میں مصروف رہتی تھیں۔ اُن کے پاس ہی پھولوں کی ایک کیاری تھی۔ جس پر بہت سی مکھیاں بھنبھناتی اور کھیلتی رہتی تھیں اور سارا دن ایک پھول سے دُوسرے پھول پر اُڑ کر اپنا دِل خوش کرتی رہتی تھیں۔ ایک چھوٹا نادان لڑکا اِن جانوروں کی مختلف عادات کو اکثر غور سے دیکھتا رہتا تھا۔ ایک دِن اُس نے حیران ہو کر کہا "کوئی جانور اِن چیونٹیوں سے زیادہ بیوقوف نہیں ہو سکتا۔ یہ دن بھر محنت مشقت کرتی رہتی ہیں اور اِن مکھیوں کی طرح اپنا دل نہیں

بہلاتیں" اس کے بعد جب کڑاکے کی سردی شروع ہوئی تو ایک
دن وہی لڑکا باغ میں آیا۔ اسے کوئی چیونٹی نظر نہ آئی۔ لیکن
بہت سی مکھیاں اِدھر اُدھر زمین پر مری ہوئی دکھائی دیں، چونکہ
وُہ ایک رحم دل بچہ تھا، اس کو اِن بدقسمت مکھیوں پر بہت
ترس آیا۔ چنانچہ اُس نے اپنے باپ سے پوچھا "یہ مکھیاں کیوں
مری پڑی ہیں؟ اور چیونٹیاں کہاں گئی ہیں؟" باپ نے
جواب دیا "چونکہ مکھیاں کام نہیں کرتی تھیں اور سردی کے لئے
اُنھوں نے ذخیرہ جمع نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ سردی سے
ٹھٹھر کر مر گئی ہیں۔ برعکس اِس کے چیونٹیاں اپنے بلوں میں آرام
کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ اُنھوں نے گرمیوں میں اپنا وقت ضائع
کرنے کی بجائے سردیوں کے لئے ذخیرہ جمع کر لیا تھا جب سردی
کم ہو جائے گی وہ اپنے بلوں میں سے نکل آئیں گی"۔

جب اقبال یہ کہانی پڑھ چکا تو پروفیسر صاحب اِسے
سیر کے لئے باہر لے گئے اور دیر تک کھیتوں میں سیر کراتے رہے
وہاں اُنھوں نے اقبال کو بہت سے پودوں کے نام بتائے

اور ان کے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ اقبال نے پروفیسر صاحب کی باتیں غور سے سُنیں اور کہا "جناب۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ اگر آپ مجھے اسی طرح پڑھاتے رہینگے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ میں سب درختوں اور جڑی بُوٹیوں کے نام اور خواص بہت جلد سیکھ جاؤں گا"۔

جب وہ گھر واپس آرہے تھے تو اقبال نے دیکھا کہ ایک چیل ایک چوزے کو پھاڑ رہی ہے۔ اقبال کو معلوم تھا کہ چیل ایک گوشت خور جانور ہے۔ اس لئے وُہ چلّا کر اُس کی طرف جھپٹا۔ چیل ڈر کر اُڑ گئی اور زخمی چُوزے کو وہیں چھوڑ گئی۔ اقبال نے کہا "دیکھیئے جناب، ظالم جانور نے اس بیچارے کو کیسا ادمؤا کر دیا ہے۔ بیچارے نے اپنے پر و بازو کس طرح نیچے لٹکا دیئے ہیں۔ میں اسے اپنے سینہ سے لگا کر گرم کروں گا اور گھر لیجاؤنگا جب تک یہ تندرست اور روانہ دنکا کھانے کے قابل نہیں ہو جائے گا۔ میں اسے اپنے کھانے میں سے حصّہ دیا کروں گا"

گھر پہنچ کر اقبال نے زخمی چُوزے کو پانی پلایا اور ایک ٹوکری

میں تھوڑی سی بھس ڈال کر آرام سے لٹا دیا - پھر وہ اور پروفیسر صاحب کھانے کے کمرہ میں گئے ۔

انور کا پہلا سبق

انور تھک کر گھر میں لوٹ آیا تھا اور اس کو تیز بھوک لگی ہوئی تھی - اس لئے جب پروفیسر صاحب اور اقبال کھانا کھانے بیٹھے تو وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گیا - لیکن پروفیسر صاحب نے اسے مخاطب کر کے کہا "جناب آپ ایک شریف آدمی ہیں اور کام کرنا پسند نہیں کرتے - بلکہ کام کرنے کو برا سمجھتے ہیں اس لئے ہم بھی آپ کو محنت مزدوری کر کے کھلانا نہیں چاہتے" ۔

یہ سچی بات سن کر انور ایک کونے میں دبک کر جا بیٹھا اور رونا شروع کر دیا - اسے بھوکے رہنے کی بہ نسبت اس بات کا غصہ زیادہ تھا کہ کسی کو بھی اس کے رونے کی پرواہ نہ تھی -

اقبال اپنے دوست کا اِس طرح رونا برداشت نہ کرسکا اِس لئے اُس نے پروفیسر صاحب کو کہا :-

"جناب عالی! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اپنے حِصّہ کو جس طرح چاہوں بانٹ سکتا ہوں"۔

پروفیسر صاحب - "یقیناً"

اقبال - "بہت خوب - میں اپنا حِصّہ سارے کا سارا، انور کو جس کی ضرورت مجھ سے زیادہ ہے دیتا ہوں"۔

یہ کہہ کر اقبال اپنا حِصّہ انور کے پاس لے گیا - انور نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جھٹ پٹ کھانا شروع کر دیا - یہ دیکھ کر پروفیسر صاحب نے کہا "خوب - میں اب سمجھا - اگرچہ شریف آدمی اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کرنا بُرا سمجھتے ہیں - تاہم وہ دُوسرے لوگوں سے جو محنت کرکے اور پسینہ بہا کر غلّہ پیدا کرتے ہیں، مُفت روٹی لے کر کھانے میں عار نہیں سمجھتے" یہ سُن کر انور اور زیادہ زور سے رویا - لیکن بھُوک کا غلبہ تھا - رونے کے باوجود کھانا بھی کھاتا گیا۔

دوسرے دن پروفیسر صاحب اور اقبال حسبِ معمول صبح سویرے باغ میں کام کرنے کے لئے گئے۔ ابھی اُنہوں نے کام شروع ہی کیا تھا کہ انور وہاں پہنچ گیا اور ایک کھرپا مانگ کر اس نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ اُس نے پہلے کبھی ایسا کام نہ کیا تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنی ٹانگوں پر کئی زخم لگائے یہ دیکھ کر پروفیسر صاحب نے اپنا پھاوڑا زمین پر رکھ دیا اور انور کو کام کرنا سکھایا۔ تھوڑی دیر میں، وہ پروفیسر صاحب کی مدد اور اپنے شوق سے بہت کچھ سیکھ گیا اور خوشی خوشی کام کرتا رہا۔ جب کام ختم ہو گیا تو تینوں گھر میں گئے۔ ناشتہ کے وقت جب انور کو بھی حصّہ مِلا تو اس کو بے اندازہ خوشی ہوئی۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ ایسا لذیذ ناشتہ میں نے پہلے کبھی نہیں کھایا اس کی وجہ یہ تھی کہ کھلی ہوا میں کام کرنے سے اسے اشتہائے صادق پیدا ہو گئی تھی اور بھوک بہترین چٹنی ہے ۔

جب ناشتہ ہو چکا تو پروفیسر صاحب نے ایک کِتاب نکالی اور انور سے کہا "اس میں سے ایک کہانی پڑھو" لیکن

انور نے شرمسار ہو کر جواب دیا "مجھے پڑھنا نہیں آتا" پروفیسر صاحب نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہیں" پھر انہوں نے اقبال کو پڑھنے کے لئے فرمایا۔ چنانچہ اقبال نے مندرجہ ذیل کہانی پڑھی :-

ایک امیر آدمی اور مزدور کی کہانی

ایک شہر میں ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ اُس کا تمام وقت کھانے پینے سونے اور تفریحِ طبع میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے بہت سے نوکر تھے وُہ بہت مغرور تھا اور سمجھتا تھا کہ کل دنیا اس کی تابعدار ہے اور غریب لوگ صرف خدمت کرنے اور کہا ماننے کے لئے پیدا ہوئے ہیں ؏

اس امیر آدمی کی حویلی کے پاس ہی ایک غریب مزدور رہتا تھا جو ٹوکریاں بنا کر اپنا پیٹ پالتا تھا - وہ صبح سے شام تک محنت کرتا تھا - اِسے خشک روٹی یا اُبلے ہوئے چاولوں سے بہتر کوئی غذا نہ ملتی تھی اور گو وُہ زمین پر سوتا تھا تاہم وہ ہمیشہ خوش باش اور قانع رہتا تھا - ہاتھ پاؤں ہلانے سے اِسے بھوک خوب لگتی تھی - اور موٹی جھوٹی روٹی بہت مزادے جاتی تھی - جب وُہ کام کرنے سے تھک جاتا تو اسے بہت میٹھی نیند آتی تھی - برخلاف اِس کے امیر آدمی کو اپنی نرم سیج پر بھی چین سے نیند نہیں آتی تھی کیونکہ وُہ تمام دن بیکار رہتا تھا - وہ ورزش یا سیر وغیرہ کچھ نہیں کرتا تھا - اس لئے اُسے عُمدہ عُمدہ کھانے بھی بدمزہ معلوم ہوتے تھے - اُسے کبھی اشتہائے صادق پیدا نہیں ہوتی تھی - لیکن بھوک نہ ہونے کے باوجود وہ چٹنی - مربّے اور دیگر لذیذ اشیاء پیٹ بھر کر کھا جاتا تھا - اِس لئے وہ ہمیشہ بیمار رہتا تھا - چونکہ وُہ کسی کے ساتھ نیک سلوک نہیں کرتا تھا - اِس لئے درحقیقت اُس کا کوئی دوست نہ تھا - اُس کے نوکر

اس کے مُنہ پر اس کی بہت تعریف کرتے تھے۔ لیکن اُس کی پیٹھ کے پیچھے اسے بُرا کہتے تھے۔ اس کے تمام ہمسائے اس سے نفرت کرتے تھے۔ اِن وجوہ کے باعث وہ ہمیشہ بیمار، غمگین اور سست رہتا تھا۔ جو لوگ اِسے اپنے سے زیادہ خوش نظر آتے تھے وہ اِن سے بہت ناراض تھا۔ جب وہ پالکی میں سیر کے لئے نِکلتا تو وہ اِس ٹوکریاں بُننے والے غریب مزدور کو خوش وخرم دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا اور جل بھُن کر کہتا "اِس غریب اور رذیل آدمی کو ہمیشہ تندرست اور خوش رہنے کا کیا حق حاصل ہے جب کہ میں، ایک امیر اور شریف آدمی ہوں، ہمیشہ بیمار اور غمگین رہتا ہوں"۔ یہ خیال اُس کو ہر وقت ستاتا۔ یہاں تک کہ اس کو اس غریب آدمی سے دلی نفرت اور للٰہی بُغض ہو گیا۔ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا نہیں جانتا تھا، اس لئے اُس نے اِس غریب مزدور کو اِس جرم کی، کہ وہ مجھ سے زیادہ خوش کیوں رہتا ہے سزا دینے کا پختہ اِرادہ کر لیا۔

اپنے دِل میں یہ بُری نیت ٹھان کر اُس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ مزدور کی جھونپڑی کو آگ لگا دو۔ نوکروں کو جرأت نہ تھی کہ حکم عدولی کر سکیں۔ اِس لئے اُنہوں نے ایک رات اِس غریب مزدور کی جھونپڑی جلا کر خاکِ سیاہ کر دی۔

بیچارہ غریب مزدور اس مغرور امیر آدمی سے انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے حاکمِ شہر کے سامنے، اپنا دُکھڑا رو رو کر بیان کیا اور انصاف چاہا۔ حاکم نیک اور منصف مزاج تھا۔ امیر و غریب اس کی نظروں میں برابر تھے۔ اس نے امیر آدمی کو کچہری میں طلب کیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ مزدور نے سچ بولا ہے تو اُس نے حکم دیا کہ دونو کو جہاز میں بٹھا کر وحشیوں کے ملک میں چھوڑ دیا جائے روانگی سے قبل، حاکم نے غریب آدمی کو الگ بُلا کر سمجھا دیا کہ میرا مطلب مغرور امیر کو انسانیت اور انصاف سکھانا ہے۔"

ملاحوں نے ان دونو کو ایک دُور دراز ملک میں، جہاں وحشی آدمی جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور سمندر سے مچھلیاں پکڑ کر

گذارہ کرتے تھے، چھوڑ دیا ۔ جونہی کہ یہ لوگ ساحل پر اُترے وہاں کے باشندے ان کے گرد جمع ہو گئے ۔ امیر آدمی نے ننگے دھڑنگے وحشیوں کو دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا ۔ جس پر اُنھوں نے اُسے خوب پیٹا ۔ لیکن مزدور نے، جو کہ بچپن سے محنت، مشقّت اور خطرات کا عادی تھا، اُن لوگوں کو اشاروں سے سمجھایا کہ میں تمہارا دوست ہوں اور تمہاری خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں ۔ یہ دیکھ کر اُن لوگوں نے اس کو اشاروں سے سمجھایا کہ وہ اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے بلکہ ان سے مچھلیاں پکڑنے اور لکڑیاں اُٹھانے میں مدد لیں گے چنانچہ وُہ ان دونوں کو کچھ فاصلہ پر ایک جنگل میں، جہاں بہت سے درخت کٹے پڑے تھے، لے گئے اور حکم دیا کہ لکڑیاں اُٹھا کر گاؤں میں لے آؤ ۔

دونوں نے کام شروع کر دیا ۔ غریب آدمی دیکھنے میں دُبلا پتلا تھا لیکن مضبوط اور مستعد تھا، اس لئے اُس نے اپنے حِصّہ کا کُل کام بہت جلد ختم کر دیا ۔ امیر آدمی لحیم شحیم ضرور تھا ۔ مگر

اس کے ہاتھ پاؤں نازک تھے اور وہ محنت کا عادی نہ تھا۔ اس لئے وہ شام تک بمشکل اپنے حصہ کا ایک چوتھائی کام کر سکا۔ یہ دیکھ وحشی آدمیوں نے خیال کیا کہ لاغر اندام آدمی دِل لگا کر کام کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اس سے بہت خوش ہوئے اور اسے بہت سی مچھلیاں کھانے کو دیں۔ برعکس اس کے وہ موٹے امیر سے بہت ناراض ہوئے اور اسے بہت کم خوراک دی۔ امیر آدمی پیچ و تاب کھاتا تھا مگر اس کا بس نہ چل سکتا تھا لیکن دن بھر کی دوڑ دھوپ سے اس کی بھوک چمک اُٹھی تھی۔ گو اس کا جی وحشیوں کی خوراک کھانے کو نہیں چاہتا تھا۔ تاہم وہ اسے تھوڑی سی مچھلیاں، مرغن کھانوں سے بھی زیادہ لذیذ معلوم ہوئیں۔

اس کے بعد ہر روز، دونو اسی طرح کام کرتے رہے چونکہ ٹوکریاں بنانے والا اپنے ساتھی سے بہتر کام کرتا تھا۔ اس لئے ملک کے باشندے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے تھے اور وہ یہاں بھی ویسا ہی خوش و خرم اور ہشاش بشاش رہتا

تھا جیسے کہ وُہ اپنے وطن میں رہتا تھا - امیر آدمی دل ہی دل میں
حسد کی آگ سے جلتا رہتا تھا ۔

رفتہ رفتہ امیر آدمی کو اپنی نا انصافی اور حماقت کی سمجھ آنے
لگی - اسے معلوم ہو گیا کہ غریبوں سے نفرت کرنا میری غلطی تھی - چند
ہفتوں کے بعد وہاں ایک واقعہ ایسا ہوُا - جس سے اِسے
اپنی دولت مندی اور مزدور کے افلاس کی حقیقت بخوبی معلوم
ہو گئی ۔

ایک وحشی کو ساحلِ سمندر پر چند خوبصورت سیپ مِلے
اُس نے اُنہیں اپنی پیشانی پر باندھ لیا اور اس آرائش سے
خوش ہو کر اکڑ اکڑ کر چلنے لگا - ٹوکری والے نے اِس کے غرور
کو دیکھ کر گھاس کے تھوڑے سے تنکے جمع کئے اور ایک
خوبصورت ہار بنا کر اِسے پہنا دیا - پھر تو وہ وحشی خوشی سے
ناچنے لگا اور دوسروں کو اپنی خوبصورت چیزیں فخر سے دکھانے
لگا - اِس کے بعد ایک ایک کر کے سب وحشیوں نے اِسے
ایسے ہی ہاروں کی فرمائش کی اور اس کے معاوضہ میں نہ صرف

اِسے لکڑیاں اُٹھانے کی معافی دے دی بلکہ ایک خوبصورت جھونپڑی اِسے رہنے کے لئے بنا دی۔ برعکس اِس کے امیر آدمی، جس کو کوئی ہنر نہیں آتا تھا، ان لوگوں کی نظروں میں گر گیا۔ اُنہوں نے اِسے ٹوکری بنانے والے کا نوکر مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ مزدور کی خدمت گزاری کے علاوہ ہاروں کے لئے لمبی گھاس کاٹ کر جمع کیا کرے ؎

ایک سال کے بعد حاکم نے انہیں وطن واپس بلایا اور امیر آدمی کی طرف غصّہ سے دیکھ کر کہا "میں نے تم کو سکھا دیا ہے کہ تم ایک حقیر اور ناکارہ آدمی ہو۔ تم نے اپنی دولت کے گھمنڈ میں جس آدمی کی دِل آزاری کی تھی وہ تم سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر میں انصاف کروں تو مجھے تمہارا کل مال و دولت چھین کر اِس غریب آدمی کو دے دینا چاہیئے۔ لیکن مجھے تمہاری حالتِ زار پر رحم آتا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آئندہ تم ایسا ظلم کبھی نہیں کرو گے۔ اِس لئے میں صرف یہ حکم دیتا ہوں کہ اپنی نِصف دولت، اِس آدمی کو جسے تم نے تباہ کرنے کی فضول

کوشش کی تھی، بلا چوں وچرا دے دو"۔
یہ حکم سن کر ٹوکری بنانے والے نے حاکم کا شکریہ ادا کیا۔ اور عرض کیا "میں ایک غریب مزدور آدمی ہوں مجھے فضول دولت لینے کی خواہش نہیں ہے اس لئے میری یہ درخواست ہے کہ یہ مغرور آدمی مجھے میری جھونپڑی بنوا دے اور آئندہ کے لئے ظلم سے توبہ کر لے"۔
امیر آدمی غریب مزدور کی فیاضی دیکھ کر دنگ رہ گیا اسے اب مصیبتیں سہنے سے عقل آ گئی تھی۔ اس نے نہ صرف ٹوکری بنانے والے کو اپنا دوست بنا لیا۔ بلکہ اپنی بقیہ عمر غریبوں اور محتاجوں کی خدمت میں صرف کی اور "دل بدست آور کہ حج اکبر است" کا عملی وظیفہ خواں بنا رہا۔

نام منظور ہے توفیض کے اسباب بنا
چاہ بنا، پل بنا، مسجد و تالاب بنا

کہانی ختم ہوئی تو انور نے اس کی بہت تعریف کی اور کہا "اگر میں ٹوکری بنانے والا ہوتا تو اس امیر آدمی کی کل دولت لے لیتا" ۔

اقبال نے کہا "لیکن میں ایسا نہ کرتا۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہوتا کہ فراواں دولت پانے کے بعد، کہیں میں بھی ویسا ہی مغرور، بدکار اور سست نہ ہو جاؤں"

اس کے بعد پروفیسر صاحب اور ان کے دونوں شاگرد ہر روز صبح باغ میں کام کرتے اور پھلوں کا ناشتہ کرنے کے بعد کوئی دلچسپ کہانی پڑھتے۔ چند دنوں کے بعد اقبال ایک ہفتہ کے لئے اپنے گھر گیا اور انور اور پروفیسر صاحب اکیلے رہ گئے ۔

انور کا دوسرا سبق

اگلے روز باغ میں کام ختم کرنے کے بعد انور کو امید تھی کہ

پروفیسر صاحب مجھے کچھ پڑھ کر سُنائیں گے۔ لیکن ناشتہ کرنے کے بعد پروفیسر صاحب دُوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے اور انور کو یہ معلوم کر کے بہت مایوسی ہوئی کہ وُہ مجھے کہانی نہیں سُنا سکتے۔ دوسرے روز بھی یہی حادثہ پیش آیا اور اقبال کی عدم موجودگی میں ہر روز ایسا ہی ہوتا رہا کہ پروفیسر صاحب کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو جاتے رہے اور انور کہانی نہ سُن سکا۔ یہ دیکھ کر انور نے سوچا "اگر میں بھی اقبال کی طرح پڑھنا جانتا تو مجھے کسی سے کہانی سُننے کی ضرورت نہ ہوتی اور میں مطالعہ سے اپنا جی خود ہی بہلا سکتا۔ میں پڑھنا ضرور سیکھوں گا۔ کیونکہ پروفیسر صاحب کہا کرتے ہیں جو کام ایک آدمی کر سکتا ہے دوسرے آدمی بھی ضرور کر سکتے ہیں۔ مانا کہ اقبال بہت ذہین اور تیز ہے۔ لیکن کوشش سے میں بھی ویسا ہو سکتا ہوں۔ جب وہ واپس آئے گا تو میں اس سے پڑھنا لکھنا ضرور سیکھوں گا"۔

جب اقبال واپس آیا تو انور نے اس سے پڑھنا شروع

کر دیا ۔ چونکہ وُہ بہت شوق سے پڑھتا تھا اور اقبال بھی اُسے بڑی محنت سے پڑھاتا تھا ۔ اس لئے اُس نے تین مہینے میں پڑھنا بخوبی سیکھ لیا اور اپنی قابلیت دکھا کر پروفیسر صاحب کو حیران کرنے کا ارادہ کیا ۔ چنانچہ ایک دِن جب کہ وُہ حسبِ معمول ناشتہ کر چکے اور اقبال کو پڑھنے کے لئے کتاب دی گئی ۔ تو انور نے اُٹھ کر کہا " اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں پڑھنے کی کوشش کروں " پروفیسر صاحب نے بہت خوشی سے اجازت دی اور انور نے مسرور ہو کر یوں پڑھنا شروع کیا :-

دو کتّوں کی سرگذشت

دُنیا کے ایک حصّہ میں ، جہاں بہت سے خونخوار اور وحشی جانور رہتے ہیں ، ایک غریب آدمی نے دو کتّے اپنی حفاظت کے لئے پال رکھے تھے ۔ وُہ کتّے بہت مضبوط "

توانا اور چست و چالاک تھے۔ پڑوس میں ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ غریب آدمی نے سوچا کہ ایک کتا امیر آدمی کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اُس نے بڑا کُتا جس کا نام قیصر تھا اور جو زیادہ مضبوط اور بہتر شکاری تھا امیر آدمی کی نذر کر دیا اور چھوٹا کتا جس کا نام ٹامی تھا اپنے ریوڑ کی حفاظت کے لیئے رکھ لیا۔

اس وقت سے دونو کتوں کی پرورش میں نمایاں فرق ہو گیا تھا۔ قیصر کو امیر کے ہاں عُمدہ عُمدہ غذائیں پیٹ بھر کر کھانے کو ملتی تھیں اور کوئی کام کرنا نہیں پڑتا تھا۔ اس لیئے وہ بہت موٹا تازہ اور خوبصورت ہو گیا۔ لیکن چونکہ اسے بغیر محنت کئے شب و روز پیٹ بھرنے کے لیئے کافی غذا مِل جاتی تھی، وہ نہایت بزدل اور ڈرپوک ہو گیا۔ یہاں تک کہ گلی میں چھوٹے چھوٹے کتوں سے بھی ڈر کر بھاگ جاتا۔ شہر میں رہ کر اُس نے صرف ایک بات سیکھی وہ یہ تھی کہ اشارہ پر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا اور اپنے

مالک اور نوکروں کے سامنے دُم ہلا کر بڑے پیار سے بیٹھ جاتا۔
برعکس اِس کے ٹامی کو بمشکل پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا تھا
وُہ موٹا تازہ اور خوبصورت نہ تھا اور نہ اُس نے لوگوں کو خوش
کرنے کے لئے کوئی کرتب سیکھے تھے۔ چونکہ اُس کا مالک غریب
تھا اور ٹامی کو اس کے ساتھ ہر قسم کے موسم میں کھُلی ہوا میں رہنا
پڑتا، اور بھیڑیوں کی حفاظت کرنے میں بھیڑیوں کا مقابلہ کرنا
پڑتا، اِس لئے وُہ بہت جفاکش، محنتی اور نڈر ہوگیا۔ کئی دفعہ
بھیڑیوں نے اِسے بُری طرح سے کاٹا لیکن رفتہ رفتہ وہ ایسا
ہوشیار ہوگیا کہ بھیڑیئے بھی اس سے دم دبا کر بھاگ جاتے تھے
چند ماہ کے بعد امیر آدمی سیر و تفریح کے لئے دیہات میں
آیا۔ اس نے ٹامی کی خستہ حالت کو نفرت سے دیکھا اور قیصر کی
بہت تعریف کی۔ لیکن بہت جلد اس کو اپنی رائے بدلنی پڑی
شام کے وقت وہ ایک گھنے جنگل میں سیر کے لئے نکلا تو ایک بھوکے
بھیڑیئے نے جس کی آنکھیں شعلہ کی طرح چمک رہی تھیں۔ جھاڑی
میں سے نکل کر، اُس پر حملہ کیا۔ اس وقت اس کے ساتھ دو

کتوں کے سوا کوئی اور جانور یا آدمی نہ تھا۔ قریب تھا کہ بھیڑیا اس کو کھا جاتا۔ امیر آدمی ڈر کے مارے کانپ رہا تھا اور جب اُس نے دیکھا کہ اس کا موٹا تازہ قیصر مدد کرنے کی بجائے دُم دبا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تو اس کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے اس مایوسی کے وقت حقیر منش ٹامی نے وُہ شجاعت دکھائی۔ کہ امیر آدمی دنگ رہ گیا۔ ٹامی بھیڑیئے پر کُود پڑا۔ گو اِسے بہت سے زخم لگے۔ تاہم وُہ آخیر دم تک لڑتا رہا حتیٰ کہ اُس نے بھیڑیے کو چیر پھاڑ کر مار ڈالا۔

امیر آدمی اپنی جان کی سلامتی پر بہت خوش ہوا اور حقیر ٹامی اس کی نظروں میں بہت قیمتی ہو گیا کیونکہ اب تجربہ نے اسے بتا دیا کہ ظاہری شکل وصورت پر نہیں جانا چاہیئے جیسا کہ شیخ سعدی نے اپنی گلستان میں لکھا ہے

آں شنیدی کہ لاغرِ دانا گفت رُوزے بابلہے فربہ
اسبِ تازی اگر ضعیف بود ہم چناں از طویلۂ خر بہ
سب پہاڑوں سے ہے چھوٹا کوہ طور ہے مگر رُتبہ میں افضل بالضرور

بعض اوقات جھونپڑوں میں رہنے والے وہ کارہائے نمایاں کرتے ہیں جو بڑے بڑے آدمیوں سے بھی نہیں ہو سکتے ۔

نیک اور بد تربیت کے نتائج

پروفیسر ابراہیم صاحب نے کہا " شاباش میاں انور میں دیکھتا ہوں کہ جب امیر لوگ دل لگا کر کوئی کام شروع کرتے ہیں تو وہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح اسے بحسن اسلوب ختم کر لیتے ہیں ۔ میں خوش ہوں کہ تم نے پڑھنا سیکھ لیا ہے ۔ اچھا بتاؤ ۔ اس کہانی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟ دو نو کتوں میں سے تم کس کو پسند کرتے ہو ؟ موٹے تازے کتے کو جو مصیبت کے وقت اپنے مالک کے کام نہ آیا یا اس غریب دبلے پتلے

ٹامی کو جو اس کی حفاظت کے لئے اپنی جان پر کھیلنے سے باز نہ رہا ؟"

انور: "جناب - میں ٹامی کو پسند کرتا ہوں اگر وہ میرے پاس ہو تو میں اسے اچھے کھانے کھلاؤں اور نہلا دھلا کر قیصر کی طرح موٹا تازہ اور خوبصورت بنا لوں" ۔

پروفیسر صاحب: "لیکن اس سلوک سے کیا وہ بھی قیصر کی طرح نکما اور بزدل نہ ہو جائے گا ؟ خیر - ابھی یہ تو کہانی باقی ہے اسے ختم کر لو" ۔

پھر انور نے یوں پڑھنا شروع کیا :-

امیر آدمی ٹامی سے اس قدر خوش ہوا کہ کسان سے مانگ کر اسے اپنے ساتھ لے گیا اور وہ قیصر سے اس قدر ناراض ہوا کہ اسے گاؤں میں چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ ایسے نکمے بزدل کتے کو گولی مار دو ۔

جب امیر آدمی چلا گیا تو کسان نے امیر آدمی کے حکم مطابق قیصر کو گولی مارنے کی تیاری کی - لیکن قیصر کی خوبصورت

شکل دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔ خاص کر جب قیصر دُم ہلاتا ہوا اُس کے پاؤں کے پاس آرام سے بیٹھ گیا تو اُس نے اُس کی جان بخشی کر دی۔ کسان نے سوچا کہ گاؤں میں رہ کر شاید قیصر بھی مفید اور بہادر بن جائے۔ اس دن سے قیصر کے ساتھ اس کے بھائی ٹامی جیسا سلوک شروع ہو گیا۔ اسے بہت قلیل خوراک ملتی تھی۔ اِس لئے وہ تھوڑے عرصہ کے بعد چست و چالاک ہو گیا۔ جب بارش ہوئی تو وُہ دبک کر آگ کے پاس آ بیٹھا جیسا کہ وُہ امیر آدمی کے ہاں کیا کرتا تھا۔ لیکن کسان کی بیوی نے اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اِس طور سے وُہ چند مہینوں میں ہر ایک قسم کے موسم میں باہر رہنے اور خوف و خطر کا مقابلہ کرنے کا عادی ہو گیا ؛

گو قیصر چست و چالاک ہو گیا تھا تاہم ابھی تک جنگلی جانوروں سے بہت ڈرتا تھا۔ ایک دن جبکہ وُہ جنگل میں سے گذر رہا تھا ایک خونخوار بھیڑیا اس پر جھپٹ پڑا۔ قیصر بھاگنا چاہتا تھا لیکن بھیڑیے نے لپک کر اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی

مصیبت بزدلوں کو بھی بہادر بنا دیتی ہے جب قیصر اس طرح زرغہ میں آگیا تو اُس نے مڑ کر اپنے دشمن پر حملہ کیا۔ اتفاقِ حسنہ سے بھیڑیے کی گردن اس کے مُنہ میں آگئی اور تھوڑی دیر میں اُس نے بھیڑیے کو جان سے مار ڈالا۔ جب کسان نے قیصر کا یہ کارنامہ دیکھا تو وُہ بہت خوش ہُوا اور اُس نے پیار سے قیصر کی پیٹھ ٹھونکی۔ فتح کی خوشی اور مالک کی حوصلہ افزائی نے اس کا دل بڑھا دیا اور اُس دن کے بعد قیصر اِتنا ہی تن چلا ہو گیا جتنا کہ پہلے بزدل تھا ؎

اب ٹامی کا حال سنئیے۔ امیر آدمی کے ہاں اِسے ہر قسم کی آسائش نصیب تھی۔ امیر آدمی اس کا مشکور تھا کہ اُس نے اس کی جان بچائی تھی۔ اِس لئے ٹامی کو کھانے پینے اور نرم نرم گدوں پر سو رہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ چونکہ دل اور جسم کے تمام جوہر مسلسل استعمال کئے بغیر ماند پڑ جاتے ہیں۔ اِس لئے ٹامی پہلے جیسا مضبوط اور بہادر نہ رہا بلکہ اس میں تمام وُہ بُرے اوصاف جو بیکاری اور بسیار خوری کا

نتیجہ ہوتے ہیں پیدا ہو گئے۔

تھوڑے عرصہ کے بعد امیر آدمی کو ایک دفعہ پھر دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ ٹامی کو اپنے ہمراہ لے گیا اور اُس نے خواہش ظاہر کی کہ ٹامی کا مقابلہ اس کے قدیم دشمن بھیڑیوں سے کرایا جائے۔ چنانچہ جب گاؤں کے لوگوں نے پاس کے جنگل میں ایک بھیڑیا کا پتہ دیا تو وہ ٹامی کو لے کر وہاں پہنچا اُسے یقین تھا کہ ٹامی گذشتہ سال کی طرح بہادری دکھائے گا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ اس کا پیارا کتا، بھیڑے کا مقابلہ کرنے کی بجائے دم دبا کر بھاگ نکلا تو اس کو بہت حیرت ہوئی۔ عین اس وقت ایک مریل سا کتا پیچھے سے دوڑ کر آیا اور اس نے بہادری سے بھیڑیے کو جان سے مار ڈالا۔ امیر آدمی کو ٹامی کی بزدلی پر بہت افسوس ہوا اور اس نے دوسرے کتے کی بہت تعریف کی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ بہادر کتا میرا پرانا قیصر ہے تو وہ اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ پھر اُس نے کسان کی طرف مُڑ کر کہا "میں اب سمجھ گیا ہوں کہ وہ لوگ جو آرام

اور بیکاری کی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ کبھی بہادر نہیں ہو سکتے۔ برعکس اس کے لگاتار ورزش اور مناسب تربیت سے حقیر جانور بھی مفید اور بہادر بن جاتے ہیں ٭

جب کہانی ختم ہو گئی تو پروفیسر صاحب نے کہا "میں بہت خوش ہوں کہ انور نے پڑھنا سیکھ لیا ہے اب اس کے ہاتھ میں ایک ایسی کنجی آ گئی ہے۔ جس کی مدد سے وہ علم و کمال کے تمام دروازے کھول سکتا ہے۔ عالم لوگ اپنی عمر بھر کی محنت کے بعد جو کچھ کتابوں میں لکھ گئے ہیں۔ انور اسے اب کسی کی مدد کے بغیر پڑھ سکتا ہے۔" پھر انہوں نے انور سے متوجہ ہو کر کہا "میاں انور! اب تم نے پڑھنا سیکھا ہے تو تمہیں مناسب ہے کہ اچھی اچھی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ فضول کتابوں کے پڑھنے میں اپنا عزیز وقت ضائع کرنے کے بجائے انسان کو مذہب، اخلاق، سائنس، فلسفہ اور تاریخ کی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ نیز میں اُمید کرتا ہوں کہ جس طرح اقبال نے تمہیں پڑھنا سکھایا۔ اسی طرح تم بھی دوسروں کو

پڑھنا سکھاؤ گے۔ علم وہی اچھا ہوتا ہے جو نافع ہو اور جس کے فیض سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ یاد رکھو علمِ نافع حقیقی صدقۂ جاریہ ہے"۔

انور نے اس تعریف سے خوش ہو کر کہا "جی ہاں جناب میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ میں بھی دوسروں کی طرح عالم فاضل بنوں۔ گو میں ابھی چھوٹا ہوں لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ مجھے بہت سے عمر رسیدہ آدمیوں کی بہ نسبت زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ ہمارے گھر میں چھ لڑکے نوکر ہیں اور گھر میں مجھ سے بڑے ہیں لیکن ان میں کسی ایک کو بھی میری طرح پڑھنا نہیں آتا"۔ پروفیسر صاحب نے انور کی مغرورانہ باتیں سن کر سنجیدگی سے کہا "میاں یہ تو بتاؤ۔ کسی نے ان لڑکوں کو پڑھانے کی کوشش بھی کی ہے؟" انور نے جواب دیا "جی نہیں"۔

پروفیسر صاحب: "تو پھر ان کے جاہل رہنے میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ اگر تمہیں اقبال پڑھنا نہ سکھاتا تو تم بھی ویسے ہی جاہل رہتے۔ تمہیں اپنے علم پر ناز نہیں

ہونا چاہیئے - ابھی تم نے سیکھا ہی کیا ہے ؟ بڑے بڑے عالم مرتے وقت یہ حسرت دل میں لے گئے ہیں کہ اُنہوں نے بہت کم علم حاصل کیا - علم ایک ناپیدا کنار سمندر ہے - ہم اس کے ساحل پر سے چند خوبصورت سنگریزے اُٹھا کر مغرور ہو جاتے ہیں " ٭

اِس طریقہ سے پروفیسر صاحب نے انور کی تعلیم و تربیت کئی ماہ تک جاری رکھی - بُری تربیت نے اس کی عادتیں خراب کر دی تھیں اور اس کی طبیعت کے اصلی جوہر ماند کر دئے تھے - لیکن وہ حقیقت میں ایک نیکدل اور سعید بچہ تھا - چنانچہ وہ اب پروفیسر صاحب کی زیرنگرانی خاطر خواہ ترقی کرتا گیا ٭

انور کا تیسرا سبق

انور کی ایک بُری عادت یہ تھی کہ بہت جلد جوش اور

غصہ سے آگ بگولا ہو جاتا تھا - وہ سمجھتا تھا کہ مجھے ہر ایک آدمی
پر جس کے کپڑے میرے جیسے اچھے نہیں ہیں حکم چلانے کا حق
حاصل ہے - اِس غلط رائے کی بدولت اس کو اکثر مصیبت
کا سامنا ہوتا تھا اور ایک دفعہ تو اسے بہت زیادہ تکلیف
اُٹھانی پڑی ۔

ایک دن جبکہ انور گیند بلے سے کھیل رہا تھا - اس کی
گیند باڑ کے اوپر سے ہو کر دوسرے کھیت میں جا پڑی ایک
چھوٹا سا غریب لڑکا پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے اِس
کھیت میں سے گذر رہا تھا - انور نے تحکمانہ انداز سے
اسے گیند پھینکنے کا حکم دیا - چھوٹا لڑکا اِس حکم کی پرواہ کئے
بغیر چلا گیا اور گیند وہیں چھوڑ گیا - یہ دیکھ کر انور نے غصہ
سے چلا کر کہا " اجی - کیا تمہیں سُنائی نہیں دیتا ؟ " لڑکے نے
کہا " سنائی کیوں نہیں دیتا - میں بہرہ تھوڑا ہی ہوں " ۔

انور " اگر تم بہرے نہیں ہو تو تم نے گیند کیوں نہیں پھینکی ؟ "
غریب لڑکے نے متانت سے جواب دیا - " اس لئے کہ میں

پھینکنا نہیں چاہتا"۔ انور آگ بگولا ہو کر کہنے لگا "ٹھہرو تو سہی۔ میں تمہیں اِس گستاخی کی سزا دیتا ہوں" لڑکے نے جواب دیا "تم مجھے سزا نہیں دے سکتے" انور لپک کر آگے بڑھا وُہ چاہتا تھا کہ باڑ پھاند کر دوسرے کھیت میں جائے اور اِس گستاخ لڑکے کو سزا دے۔ لیکن اس کو ٹھوکر لگی اور وُہ ایک خندق میں، جو پانی اور کیچڑ سے بھری ہوئی تھی گر پڑا۔ اُس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ خندق میں سے باہر نکل سکے لیکن اس کے پاؤں کیچڑ میں گڑ گئے۔ اس کے کپڑے پانی سے تر بتر اور وُہ باہر نہ نکل سکا۔ بدقسمتی سے اس کی جوتی کھو گئی اور اس کے پاؤں کانٹوں سے زخمی ہو گئے۔ اگر وہی پھٹے پرانے کپڑے پہننے والا غریب لڑکا، جس پر انور ناحق چلّایا تھا اُس کی مدد نہ کرتا تو خدا معلوم اس کا کیسا بُرا حال ہوتا جب اس غریب لڑکے نے اس کو خندق سے باہر نکالا تو انور کا شرمندگی کے مارے بہت بُرا حال تھا۔ افتاں خیزاں وُہ گھر پہنچا۔ جب پروفیسر صاحب نے اس کی خستہ حالت دیکھی تو انہیں

اندیشہ ہوا کہ شاید اسے کچھ چوٹ لگی ہے۔ لیکن جب اُنہوں نے تمام واقعہ سُنا تو وہ ہنس پڑے اور انور کو آئندہ احتیاط کرنے اور غریب لوگوں کی دل آزاری سے باز رہنے کی تاکید کی۔

اگلے روز پروفیسر صاحب نے اقبال کو ذیل کی کہانی پڑھنے کو کہا:-

شیر اور غلام کی کہانی

ایک غلام جس کا نام سعید تھا۔ اپنے مالک کی بدسلوکی سے تنگ آکر جنگل میں بھاگ گیا۔ اس نے سوچا کہ ایسی مصیبت کی زندگی سے موت بہتر ہے، اس لئے اگر مجھے جنگل میں خونخوار درندے کھا لیں گے تو میں بے رحم مالک کے جور و ستم سے چھوٹ جاؤں گا۔ جنگل میں اسے بھوک پیاس نے بہت ستایا اس کے برہنہ پاؤں کانٹوں سے زخمی ہو گئے آخر کار وہ نکل

اور پیاس سے بیتاب ہو کر وہ ایک جھاڑی میں لیٹ گیا۔

اقبال کا دل یہ دُکھ بھری داستان پڑھ کر بہت آزردہ ہوا اور اس نے کہا "اگر میں اس غریب آدمی کے پاس ہوتا تو اسے اپنا کھانا اور چارپائی دیتا۔ لیکن جناب! آدمی ایک دوسرے کے اُوپر ظلم کیوں کرتے ہیں؟ اور بعض آدمی دوسروں کے نوکر یا غلام کیوں ہوتے ہیں؟"

انور نے جلدی سے جواب دیا "میں تمہیں بتاتا ہوں بات دراصل یہ ہے کہ بعض آدمی امیر ہوتے ہیں وہ دوسروں پر حکم چلاتے ہیں اور بعض لوگ غریب ہوتے ہیں انہیں دُوسروں کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ جب میں اپنے گھر پر تھا تو میری والدہ ماجدہ کہا کرتی تھیں کہ ہمارے سب نوکر ہماری خدمت کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور جب میں غصّہ میں ہوتا تھا تو اُن کو خوب پیٹا کرتا تھا۔ چونکہ وہ نوکر تھے وہ کبھی میرا مقابلہ نہیں کرتے تھے"۔

پروفیسر صاحب۔ "وہ آدمی نوکر کیسے ہو گئے تھے؟ کیا اُن

کی ماؤں نے انہیں نوکر جنا تھا ؟"

اقبال "جناب میرا خیال ہے کہ پیدائش کے وقت سب بچّے یکساں ہوتے ہیں" ۔

انور "لیکن جو لوگ غریب ہوتے ہیں اور دوسروں سے تنخواہ لیتے ہیں، اُن کے ساتھ جیسا سلوک چاہیں کر سکتے ہیں ؟"

انور "جی ہاں"

پروفیسر صاحب "اچھا ۔ اگر تم غریب ہو جاؤ ۔ یا میں تمہارے کپڑے تم سے چھین لوں اور تمہیں کسی اجنبی کے ہاتھ بیچ ڈالوں تو کیا اس آدمی کو حق حاصل ہو گا کہ جیسا بُرا سلوک وہ چاہے تمہارے ساتھ کرے" ۔

انور یہ سُن کر فکرمند اور لاجواب ہو گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا "جناب ۔ میں اب سمجھ گیا ۔ اقبال کا خیال درست ہے کہ امیر و غریب پیدائش کے وقت سب یکساں ہوتے ہیں ۔ آئندہ میں نہ تو اپنے نوکروں کو اور نہ کسی غریب لڑکے کو پیٹوں گا" ۔

پروفیسر صاحب ۔ "تم بہت ہی اچھے بچے بن جاؤ گے لیکن اب ہمیں کہانی ختم کرنی چاہیئے" ۔

بدقسمت سعید ابھی جھاڑی ہیں لیٹا ہی تھا کہ اسے ایک عجیب شور سُنائی دیا ۔ وہ اُٹھ کر بھاگا ۔ لیکن ابھی جھاڑی سے نکلا ہی تھا کہ اسے ایک بہت بڑا شیر اپنی طرف آتے ہوئے دِکھائی دیا ۔ اب اس کو اپنی موت کا یقین ہو گیا ۔ لیکن اس مولا کریم کی قدرتِ کاملہ کا صدقہ جائیے کہ وہی شیر اس کا دوست اور محسن بن گیا ۔

سعید کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ شیر غصہ سے اُس کے اُوپر جھپٹنے کی بجائے نہایت نرمی سے آگے بڑھا اور ایک غمناک آواز نکالتا ہوا اس کے قریب آکھڑا ہوا ۔ مصیبتیں سہ کر سعید دل کا قوی ہو گیا تھا ۔ اس لئے اس کے ہوش و حواس بجا رہے اور اس نے شیر کی طرف غور سے دیکھا ۔ اور تاڑ گیا کہ شیر ایک ٹانگ سے لنگڑاتا ہے ۔ یہ دیکھ کر وہ شیر کی طرف

بڑھا اور نہایت نرمی سے شیر کا زخمی پاؤں اپنی ٹانگ پر رکھ کر اس کا معائنہ کیا۔ ایک بہت بڑا کانٹا شیر کے پاؤں میں چبھا ہوا تھا۔ جس کے باعث پاؤں متورم ہو گیا تھا۔ سعید نے ورم میں سے کانٹا کھینچ لیا اور زخم کو دبا کر بہت سی پیپ نکالی۔ جونہیں کہ کانٹا اور پیپ اس کے پاؤں میں سے نکل گئے۔ شیر خوشی کے مارے، ایک پالتو کتے کی طرح اپنی دُم ہلا کر سعید کے پاؤں چاٹنے لگا ٭

اِس کے بعد سعید شیر کا مہمان بن گیا! وہ ایک عرصہ تک اس کے پاس رہا۔ آخر کار ایک دن جبکہ وُہ جنگل میں اکیلا گھوم رہا تھا۔ چند سپاہیوں نے اِسے پکڑ لیا! اور اس کے مالک کے پاس لے گئے۔ ملک کا قانون بھاگے ہوئے غلاموں کے حق میں بہت سخت تھا۔ سعید کو فرار ہونے کے جُرم میں حکم ملا۔ کہ اسے ایک بھوکے شیر کے سامنے زندہ ڈال دیا جائے ٭

سزا کے دِن بدبخت سعید کو ننگا کر کے ایک وسیع احاطہ میں جس کے چاروں طرف ہزارہا تماشائی جمع تھے، لایا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد چند سپاہی اِس احاطہ میں ایک شیر کا پنجرہ
لائے۔ شیر کو غصہ دلانے کی خاطر، کئی دِنوں سے بھوکا رکھا گیا
تھا، جونہیں کہ پنجرے کا دروازہ کھولا گیا، بھوکا شیر جس کی
آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، دھاڑتا ہوا باہر نکلا چاروں
طرف سناٹا چھا گیا۔ سب آنکھیں اِس بیکس غلام کی طرف لگی
ہوئی تھیں۔ جس کی موت میں اب کوئی شبہ باقی نہ تھا۔
شیر چھٹتے ہی سعید کی طرف جھپٹا۔ لیکن قریب پہنچ کر اُس
پر ایک حیرت انگیز انقلاب واقع ہوا۔ سعید پر حملہ آور ہونے
کی بجائے وہ مسکینی سے اس کے پاؤں پر گر پڑا اور جیسے
کتا اپنے مالک کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہو
لیا۔ تماشائی دنگ رہ گئے۔ شہر کے حاکم نے سعید کو حکم دیا۔
کہ اس معمہ کو سمجھاؤ۔ اس نے سب لوگوں کے سامنے اپنا قصہ
بیان کیا۔ سب لوگ اس کی باتیں سُن کر حیران ہو گئے۔ حاکم
نے سعید کی جان بخشی کر دی اور شیر سعید کے حوالہ کر دیا۔
اِس کہانی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نرمی اور انسانیت کے

سلوک سے وحشی جانور بھی رام ہو جاتے ہیں ؎

دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کرو

انور نے کہا :- "یہ کہانی بہت دلچسپ ہے۔ میرا خیال تھا کہ شیر اور چیتے انسان کے جانی دشمن ہوتے ہیں اور جب کبھی انہیں موقعہ ملتا ہے انسان کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں"۔

پروفیسر صاحب :- "جب وُہ بھوکے ہوتے ہیں۔ تو وُہ ضرور آدمیوں اور بھیڑ بکریوں کو کھا جاتے ہیں کیونکہ وُہ گوشت خور جانور ہیں۔ لیکن جب وُہ بھوکے نہیں ہوتے تو وُہ ناحق کسی کو نہیں ستاتے بلکہ بہت سے آدمیوں اور بچّوں کی بہ نسبت جو دوسروں پر ناحق ظلم کرتے ہیں بہتر ہوتے ہیں"۔

اقبال :۔ "جی ہاں۔ جناب بجا فرماتے ہیں۔ ایک دن میں سڑک پر جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شریر لڑکا ایک گدھے سے بہت بُرا سلوک کر رہا تھا۔ گدھا بیچارہ لنگڑا تھا۔ اور اس سے تیز چلا نہیں جاتا تھا۔ لیکن لڑکا اِسے تیز چلانے کے لئے لاٹھی سے پیٹ رہا تھا۔ میں نے اس لڑکے کو ظلم سے منع کیا اور کہا کہ اگر تم کو کوئی اِسی طرح پیٹے تو کیا تم اسے پسند کرو گے ؟"

پروفیسر صاحب :۔ "پھر اس نے کیا جواب دیا ؟"

اقبال :۔ "اس نے کہا "گدھا میرے باپ کا ہے اور مجھے اس کے پیٹنے کا حق حاصل ہے تم دخل در معقولات کرنے والے کون ہو ؟ آئے کہیں کے خدائی فوجدار ! اپنا راستہ لو۔ نہیں تو تمہیں بھی پیٹ دوں گا۔ لیکن اس نے دلیری سے جواب دیا" یہ گدھا تیرے باپ کا سہی تاہم تمہیں اس کے ساتھ بدسلوکی نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ہم سب خدا کی مخلوق ہیں اور ہمیں ایک دوسرے کو پیار کرنا چاہیئے۔ یہ سُن کر وہ غصّہ میں آگیا۔ اور

گدھے سے اُتر کر لاٹھی میرے سر پر مارنے لگا۔ میں داؤ دے کر چوٹ کو بچا گیا۔ جب وُہ دوبارہ لاٹھی اُٹھانے لگا۔ تو میں نے اس کو نیچے گرا دیا۔ اور اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ پھر تو وُہ ہاتھ جوڑ کر اور رو رو کر مجھ سے معافی مانگنے لگا"۔

پروفیسر صاحب۔ "یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جو لوگ دُوسروں پر ظلم کرتے ہیں وُہ بہت بزدل ہوتے ہیں"۔

اقبال۔ "میں نے اس کو کہا "میں تمہیں پیٹنا نہیں چاہتا لیکن جب تک تم یہ وعدہ نہ کرو کہ آئندہ غریب گدھے کو نہیں مارو نگا میں تمہیں اُٹھنے نہیں دونگا"۔ اس نے فوراً ہاتھ جوڑ کر وعدہ کر لیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا"۔

پروفیسر صاحب۔ "شاباش تم نے بہت اچھا کام کیا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس لڑکے کو تم سے معافی مانگتے ہوئے ویسی ہی شرم آئی ہو گی جیسی انور کو کل خندق میں سے اس غریب لڑکے کی مدد سے، اُٹھتے ہوئے آئی تھی، جس کو مارنے کے لئے یہ دوڑا تھا"۔

انور نے جواب دیا "اگر وُہ میری گیند میرے پاس لانے سے انکار نہ کرتا تو میں اسے ہرگز پیٹنے کی کوشش نہ کرتا" ۔

پروفیسر صاحب "لیکن تمہیں کیا حق حاصل تھا کہ اسے گیند لانے کا حکم دیتے" ۔

انور "وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور میں امیر آدمی ہوں" ۔

پروفیسر صاحب "تو کیا ہر ایک امیر آدمی کو پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے لڑکوں پر حکم چلانے کا حق حاصل ہوتا ہے" ؟

انور "جی ہاں یقیناً" ۔

پروفیسر صاحب "اگر تمہارے کپڑے پھٹ جائیں اور تمہیں نئے کپڑے پہننے کو نہ ملیں تو کیا ہر ایک امیر آدمی کو تمہارے اُوپر حکومت کرنے کا حق حاصل ہو گا" ؟

انور یہ سُن کر گھبرا گیا اور کہنے لگا "لیکن وہ میری گیند تو پھینک سکتا تھا۔ وہ باڑ کے دوسری طرف تھا" ۔

پروفیسر صاحب "اگر تم نرمی اور شرافت کے ساتھ اسے

گیند پھینکنے کے لیے کہتے تو وہ یقیناً پھینک دیتا۔ تم کہتے ہو وہ لڑکا غریب معلوم ہوتا تھا۔ کیا تم نے اس کو گیند پھینکنے کے لیے نوکر رکھ لیا تھا؟"

انور: "نہیں میں نے اُسے کچھ نہیں دیا تھا اور نہ کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا"۔

پروفیسر صاحب: "کیا اس وقت تمہاری جیب میں کچھ نہ تھا؟"

انور نے اپنی جیب میں سے کئی روپے نکال کر کہا "میرے پاس اتنے روپے تھے"۔

پروفیسر صاحب: "پھر تم نے اُس سے انعام کا وعدہ کیوں نہ کیا؟ کیا وہ انعام لے کر خوش نہ ہوتا؟"

انور: "ضرور خوش ہوتا کیونکہ اُس کا کُرتہ پاجامہ پھٹا ہوا تھا اور وہ ننگے پاؤں تھا"۔

پروفیسر صاحب: "میں اب سمجھا۔ تمہارے نزدیک شریف آدمی وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال و دولت بہت کچھ

ہو لیکن وہ کسی کو کچھ نہ دے بلکہ اگر غریب آدمی اس کی خدمت مفت کرنے سے انکار کریں تو انہیں مارنے پیٹنے کے لئے تیار ہو جائے! اور جب وہ اس کی بدسلوکی کے باوجود اس سے نیک سلوک کریں تو وہ نہ تو ان کا شکریہ ادا کرے! اور نہ کچھ معاوضہ دے۔ اس لحاظ سے وہ شیر جس نے سعید کے ساتھ نیکی کے بدلہ نیک سلوک کیا تھا۔ تمہارے جیسے امیر آدمیوں سے بدرجہا بہتر ہے"۔

انور یہ ملامت سن کر رو دیا۔ چونکہ وہ حقیقت میں نیک دل لڑکا تھا، اس نے اس غریب لڑکے کی مدد کرنے کا ارادہ کر لیا۔ شام کے وقت جب وہ سیر کو نکلا۔ تو اس نے اس لڑکے کو گھاس کھودتے ہوئے دیکھ کر کہا "میاں لڑکے تمہارے کپڑے ایسے خراب کیوں ہیں؟ کیا تمہارے پاس اور کپڑے نہیں ہیں؟"

لڑکے نے جواب دیا "نہیں ہم سات بھائی بہن ہیں اور ہمارے ماں باپ بہت غریب ہیں۔ ہم سب اسی طرح پھٹے

پرانے کپڑے پہنتے ہیں۔ لیکن اگر مجھے کھانے کو کچھ مِل جائے تو مجھے پھٹے پرانے کپڑوں کی چنداں پرواہ نہیں" ؎

انور "تمہیں پیٹ بھر کر کھانے کو کیوں نہیں مِلتا ؟"

غریب لڑکا "کیونکہ میرے ابّا جان بیمار ہیں اور کچھ کام نہیں کر سکتے۔ امّاں جان کہتی ہیں کہ اگر اللہ تعالےٰ کا فضل نہ ہوا اور ابّا جان چندے اور بیمار رہے تو ہم سب فاقوں مر جائینگے" ؎

انور یہ سُن کر جواب دیئے بغیر گھر کی طرف دوڑا اور اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا اور چند چپاتیاں لا کر اس لڑکے کو دیدیں غریب لڑکا بہت خوش ہوا۔ لیکن انور اس سے بھی زیادہ خوش ہوا کیونکہ اس نے اپنی عمر میں یہ پہلا نیک کام کیا تھا۔ وُہ خوشی سے پھولا جامہ میں سماتا تھا۔ اس نے بڑے فخر کے ساتھ پروفیسر صاحب کو یہ تمام ماجرا سُنایا۔ پروفیسر صاحب نے جواب دیا "تم نے بہت اچھا کام کیا کہ غریب لڑکے کو اپنے کپڑے دیئے لیکن تمہیں میری اجازت کے بغیر میری چپاتیاں دینے کا کوئی حق حاصل نہ تھا" ؎

انور۔ "جناب میں نے چپاتیاں اس لئے دی تھیں کہ وہ لڑکا بھوکا تھا اور کہتا تھا کہ میرا باپ بیمار ہے" ۔

پروفیسر صاحب۔ "جو چیز تمہاری اپنی ہو اُسے دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن تمہیں دوسروں کی چیزیں اُٹھا کر دے دینے کا اختیار نہیں۔ اگر اقبال تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے سب کپڑے کسی غریب آدمی کو دے دے تو کیا تم اسے پسند کرو گے ؟"

انور۔ "میں بالکل پسند نہیں کروں گا۔ میں اب اپنی غلطی سے آگاہ ہو گیا ہوں۔ آئندہ میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی کوئی چیز کسی کو نہیں دونگا" ۔

پروفیسر صاحب۔ "تمہیں ہمیشہ ایسا ہی کرنا چاہیئے اس مضمون کے متعلق تم یہ چھوٹی سی کہانی پڑھ سکتے ہو" ۔

ننھے اسلم کی کہانی

اسلم ایک چھوٹا سا ہونہار لڑکا تھا۔ اس کے استاد اُسے اچھی اچھی باتیں سکھاتے تھے۔ ایک دن اس کے ابا جان نے اس سے پوچھا۔ "تم نے آج کیا سیکھا ہے؟"

اسلم :- "ابا جان۔ مجھے آج غیر منصفانہ فیصلہ کرنے کی سزا ملی تھی"۔

باپ :- "کیوں۔ کیا ہوا تھا؟"

اسلم :- "میری جماعت میں دو لڑکے ہیں۔ ایک بڑا ہے، دوسرا چھوٹا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ چھوٹے لڑکے کا کوٹ ڈھیلا اور لمبا ہے۔ اور بڑے لڑکے کا کوٹ تنگ اور چھوٹا ہے بمشکل سے اُس کی ناف تک آتا ہے۔ اِس لئے بڑے لڑکے نے چھوٹے لڑکے کو کہا "آؤ ہم کوٹ آپس میں بدل لیں۔ تمہارا کوٹ مجھے پورا آجائے گا اور میرا کوٹ تمہیں

پُورا آجائے گا، لیکن چھوٹا لڑکا راضی نہ ہؤا۔ تاہم بڑے لڑکے نے زبردستی سے اس کا کوٹ چھین لیا اور اپنا کوٹ اُسے دے دیا۔ جب وُہ جھگڑ رہے تھے تو میں اُدھر سے گزرا اور اُنہوں نے مجھے پنچ مقرر کیا اور کہا "جو کچھ تم فیصلہ کرو گے۔ ہم مان لیں گے"۔ اِس پر میں نے فیصلہ کیا کہ چھوٹے لڑکے کو چھوٹا کوٹ رکھنا چاہیئے اور بڑے لڑکے کو بڑا۔ ہمارے استاد نے یہ واقعہ سُنا تو اُنہوں نے مجھے کہا۔ "تم نے ناانصافی کی بات کہی ہے"۔ اِس لئے اُنہوں نے مجھے سزا دی"۔

باپ۔ "لیکن کیا چھوٹا کوٹ چھوٹے لڑکے کو اور بڑا کوٹ بڑے لڑکے کو پُورا نہیں آتا تھا"؟

اسلم۔ "جی ہاں ضرور پورا آتا تھا۔ لیکن ہمارے استاد نے ہمیں سمجھایا۔ فیصلہ یوں نہیں کرنا چاہیئے تھا کہ کون سا کوٹ کس لڑکے کو پُورا آتا ہے بلکہ فیصلہ اس امر کا کرنا چاہیئے تھا۔ کہ بڑے لڑکے کو کوئی حق حاصل نہ تھا کہ چھوٹے لڑکے کا کوٹ اس کی مرضی کے خلاف پہن لے۔ اِس لئے تمہارا فیصلہ غیر منصفانہ

ہے ۔ اِس لیے تم سزا کے مستحق ہو"۔

جس وقت کہانی ختم ہوئی ۔ ایک غریب لڑکا دوڑتا ہوا اُن کے پاس آیا ۔ وُہ بغل میں چند کپڑے دبائے ہوئے تھا ۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سُرخ ہو رہی تھیں، اس کی ناک سوجی ہوئی تھی اور اس کی قمیص خون آلود تھی ۔ اُس نے جلدی سے اپنے بغل والے کپڑے انور کے سامنے پھینک دیئے اور کہا "جناب عالی! آپ کے کپڑے آپ کو ہی مبارک ہوں ۔ کاش یہ کپڑے میرے بدن پر ہونے کی بجائے اس خندق کی تہ میں ہوتے ۔ جہاں سے میں نے تمہیں نکالا تھا ۔ خیر جو ہوا سو ہوا ۔ آئندہ کے لیئے مجھے سبق حاصل ہو گیا ۔ اب تو میں کبھی ایسے بھڑکیلے اور امیرانہ کپڑے اپنے بدن پر نہیں پہنوں گا"۔

پروفیسر صاحب سمجھ گئے کہ کچھ حادثہ ضرور ہوا ہے ۔ اس لیے اُنہوں نے نرمی سے کہا "کیوں کیا بات ہوئی ہے؟"

غریب لڑکا "جناب عالی ۔ آپ کے صاحبزادہ صاحب مجھے پیٹنا چاہتے تھے کیونکہ میں نے ان کو گیند اُٹھا کر نہیں پھینکی

تھی۔ اگر وہ نرمی سے بات کرتے تو میں خوشی سے اُن کا حکم
مانتا۔ لیکن گو میں غریب ہوں، میں کسی کا نوکر نہیں ہوں۔ کہ
خواہ مخواہ ڈانٹ کھاؤں۔ چونکہ میں نے اُن کا کہا نہیں مانا
تھا۔ یہ غصّہ کھا کر مجھے مارنے کے لیئے باڑ پھاندنے لگے۔ لیکن
اُن کا پاؤں پھسل گیا اور یہ خندق میں گر پڑے۔ جہاں سے میں
نے انہیں ترس کھا کر نکالا۔ دوسرے دن اُنہوں نے یہ کپڑے
مجھے خوشی سے دیئے۔ اور میں نے یہ حماقت کی کہ انہیں اپنے
بدن پر پہن لیا۔ چونکہ یہ کپڑے ریشمی اور چمکیلے ہیں، گاؤں کے
لڑکے میرے پیچھے تالیاں بجانے لگے اور مجھے خوب مارا پیٹا
وہ کہتے تھے کہ کوّا ہو کر مجھے مور بننے کی خواہش ہے۔ اِس
لیئے میں اُن سے اپنی جان بچا کر بھاگ آیا ہوں"۔

پروفیسر صاحب نے لڑکے سے اُس کے مکان کا پتہ
پوچھ کر اقبال کو کہا "اگر تم ان کے گھر جانا پسند کرو تو میں تمہارے
ہاتھ چند روٹیاں اور تھوڑا سا سالن بھیجنا چاہتا ہوں"۔ اقبال
نے کہا "میں یہ نیک کام کرنے کے لیئے خوشی سے تیار ہوں"۔

یہ سن کر پروفیسر صاحب گھر کے اندر گئے اور انور نے
غریب لڑکے سے کہا "اچھے لڑکے۔ مجھے بہت افسوس ہے
کہ میرے کپڑوں کی وجہ سے تمہیں ایسی تکلیف ہوئی ہے" لڑکے
نے جواب دیا " صاحبزادے میں آپ کا بہت مشکور ہوں آپ
نے تو مجھ سے نیکی کی تھی۔ یہ میری بُری قسمت ہے کہ میرے ساتھ
میرے دوستوں نے بدسلوکی کی ہے۔ لیکن میں کوئی دودھ پیتا بچہ
نہیں ہوں کہ ایسی مار پیٹ کی پرواہ کروں"۔
جب غریب لڑکا چلا گیا تو انور نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ
اس لڑکے کی مدد کروں۔ بھائی اقبال۔ تم ہی کوئی تجویز بتاؤ"
اقبال "یہ تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ گاؤں میں ایک دکان
ہے۔ جہاں غریب لوگوں کے لئے پرانے کپڑے بکتے ہیں۔ اگر
آپ کے پاس کچھ روپے ہوں تو آپ بآسانی وہاں سے خرید
سکتے ہیں"۔

امیروں کی سنگ دلی

اگلے روز صبح سویرے انور اور اقبال اس کام کے لئے گھر سے نکلے۔ راستہ میں انہوں نے دیکھا کہ نواب اعظم یار جنگ کے شکاری کتے ایک خرگوش کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ اقبال نے غصہ سے کہا "یہ امیر لوگ کیسے بے رحم اور ظالم ہوتے ہیں۔ انہیں غریب بے ضرر جانوروں پر ترس نہیں آتا۔ کیا یہ لوگ خدا سے نہیں ڈرتے؟ ان کو چاہیئے کہ خونخوار جانوروں مثلاً شیر چیتے وغیرہ کا شکار کھیلا کریں"۔

دونو دوست یہ باتیں کر رہے تھے کہ مظلوم خرگوش ڈر کے مارے ان کے سامنے ایک جھاڑی میں آ کر چھپ گیا۔ تھوڑی دیر میں شکاری کتے بھی وہاں آ پہنچے۔ ان کے ساتھ ساتھ نواب اعظم یار جنگ بھی گھوڑے پر آیا اور نہایت کرخت۔ لہجہ میں اقبال سے پوچھنے لگا "کیا تم نے ہمارا خرگوش دیکھا ہے؟" اقبال

خاموش رہا۔ اِس پر نواب نے چلا کر کہا "میں پوچھتا ہوں۔ کیا تم نے ہمارا خرگوش دیکھا ہے؟" اقبال نے کہا "جی ہاں دیکھا ہے"۔ پھر نواب نے پوچھا۔ "وہ کدھر گیا ہے؟" اقبال نے دلیری سے جواب دیا "جناب عالی۔ میں اِس غریب جانور کا دشمن نہیں ہوں۔ میں نہیں بتاؤں گا کہ وُہ کِدھر گیا ہے"۔ یہ سُن کر نواب کو غصہ آ گیا اور اُس نے اقبال کو پیٹنا شروع کر دیا۔ جب خوب پیٹ چکا۔ تو اُس نے پھر کہا "بدمعاش کہیں کا۔ کیا اب بھی نہیں بتلائے گا؟" اقبال نے کہا "خواہ مجھے جان سے مار ڈالیں تو بھی میں نہیں بتاؤں گا"۔

اقبال کی جرأت اور انور کے آنسوؤں کا ظالم نواب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے نہایت بیدردی سے اقبال کو پھر پیٹنا شروع کر دیا اور شاید وُہ غصہ کے جنون میں اقبال کو بالکل زخمی کر دیتا لیکن خیریت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سوار وہاں پہنچ گیا اور اُس نے کہا "نواب صاحب۔ خدا کے لئے اس لڑکے کو چھوڑ دیجئے۔ ورنہ بہت خرابی ہو گی آپ غالباً

پروفیسر ابراہیم صاحب کو نہیں جانتے۔ وُہ بہت غیرت والے
آدمی ہیں۔ یہ لڑکے اُن کے پاس رہتے ہیں۔ اُن کو خبر ہو گئی۔
تو مقدمہ تک نوبت پہنچے گی" جب یہ باتیں ہو رہی تھیں شکاری
کُتے جھاڑی کے چاروں طرف خرگوش کی بُو سُونگھ رہے تھے۔
خرگوش کو دیکھ کر وُہ زور سے بھونکے۔ خرگوش ڈر کر باہر نکل
آیا اور کُتے اور نواب اعظم یار جنگ اس کے تعاقب میں
چل دیئے ۔

جب سب لوگ چلے گئے تو انور نے نہایت پیار اور
ہمدردی سے اقبال سے پوچھا "کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟"
اقبال۔ "چوٹیں تو بہت لگی ہیں لیکن کچھ مضائقہ نہیں" ۔
انور۔ "کاش میرے پاس اس وقت بندوق یا تلوار ہوتی" ۔
اقبال۔ "تو پھر تم ان کے ساتھ کیا کرتے؟"
انور۔ "میں اس بے رحم نواب کو جس نے تمہیں ایسی بیدردی
سے پیٹا ہے" جان سے مار ڈالتا" ۔
اقبال۔ "لیکن اگر تم ایسا کرتے تو بہت غلطی کرتے۔ کیونکہ وُہ

مجھے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا اگر میں جوان ہوتا تو وہ مجھے ہرگز نہ مار سکتا۔ کیونکہ تب میں دلیری سے اس کا مقابلہ کرتا۔ ہمیں فراخ دلی سے اپنے دشمنوں کو معاف کر دینا چاہیئے۔ جیسا کہ نبی کریمؐ نے اپنے دشمنوں کو فتح مکّہ کے بعد معاف کر دیا تھا"۔

انور: "میں حیران ہوں، تم اتنا پٹے ہو۔ تاہم تم بالکل نہیں روئے"۔

اقبال: "کیا رونے سے میری تکلیف کم ہو جاتی ہے"

امیروں کے غلط خیالات

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے دونوں دوست کپڑوں کی دُکان پر پہنچ گئے۔ انور نے پانچ روپے کے کپڑے اُس غریب لڑکے اور اس کے بھائی بہنوں کے لئے خریدے۔ دکاندار نے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر انور کے حوالہ کر دی۔ لیکن انور

نے اس گٹھڑی کو نہ اُٹھایا بلکہ اقبال سے کہا کہ تم اُٹھا لو۔ اقبال نے جواب دیا "میں خوشی سے یہ گٹھڑی اُٹھانے کیلئے تیار ہوں لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم خود اِسے کیوں نہیں اُٹھانا پسند کرتے ہو؟"

انور "اس لئے کہ امیر آدمی گٹھڑیاں خود نہیں اُٹھاتے"۔

اقبال "اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا اُن کے ہاتھ دُکھتے ہیں؟ یا انہیں کچھ اور تکلیف ہوتی ہے؟"

انور "میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ امیر لوگ عام آدمیوں سے ممتاز ہونا چاہتے ہیں اور اُن سے مشابہت رکھنا پسند نہیں کرتے"۔

اقبال "بہت خوب۔ اگر امیر لوگ عام آدمیوں سے ممتاز ہونا چاہتے ہیں اور اُن کی مشابہت سے گریز کرتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ عام آدمیوں کی طرح ہاتھ، پاؤں، ناک، کان، آنکھیں کچھ نہ رکھیں"۔

انور "یہ کیوں نہ رکھیں۔ ان کا رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ چیزیں مفید ہیں"۔

اقبال "یہ چیزیں جبھی مفید ہو سکتی ہیں کہ انسان انہیں استعمال کرے اور اپنے کام حتی الامکان خود کرے"۔

انور۔ "ٹھیک ہے۔ لیکن امیر آدمیوں کے پاس کام کرنے کے لئے بہت سے نوکر ہوتے ہیں"۔

اقبال "بعض اوقات امیر آدمیوں پر بھی ایسے موقعے پیش آجاتے ہیں کہ وہ تنہا ہوتے ہیں، نوکر چاکر ہمراہ نہیں ہوتے جیسے کہ اس وقت تمہاری حالت ہے۔ اگر وہ ہر حالت میں اپنے ہاتھ سے کام کرنا معیوب خیال کریں تو ایسی حالت میں کام کیسے چلے" یہ سن کر انور لاجواب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اقبال نے پھر کہا "اس کے علاوہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس قسم کی شرافت یا امارت ایک بری چیز ہے۔ اگر سب آدمی ایسے امیر ہوں تو یہ دنیا فاقوں مر جائے۔ کیونکہ پھر دنیا میں کام کرنے والا کوئی نہ رہے"۔

انور۔ "یہ کیسے؟"

اقبال۔ "جب تک زمین میں ہل نہ جوتا جائے۔ بیج نہ بویا

جائے - کنوآں چلاکر کھیت میں پانی نہ دیا جائے اور بیسیوں اور کام نہ کئے جائیں - روٹی میسّر نہیں ہو سکتی - اگر سب آدمی تمہاری طرح ہو جائیں تو یہ کام کون کرے ؟ اور اگر یہ کام کوئی نہ کرے تو اناج کا ایک دانہ بھی پیدا نہ ہو اور سب لوگ فاقوں مر جائیں" ۔

انور "میں اب تمہاری بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں - اپنا کام حتی الامکان آپ کرنا چاہیئے یہ میری غلطی تھی کہ کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھانے کو اپنے لئے معیوب خیال کیا اور تم سے اس کے اُٹھانے کی فرمائش کی - حالانکہ تم میرے نوکر نہیں بلکہ میری طرح شریف ہو" یہ کہہ کر انور نے کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھانی چاہی لیکن اقبال نے نہ دی ۔

اقبال کی فراخ دلی

غریبوں کی عالی حوصلگی

انور اور اقبال یہ باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ انہیں کچھ شور سنائی دیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک خوفناک نظارہ دکھائی دیا۔ ایک گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی جس کا پاؤں رکاب میں پھنسا ہوا تھا زمین پر گھسیٹتا ہوا جا رہا تھا۔ گرے ہوئے سوار کی خوش بختی تھی کہ زمین نرم تھی۔ اِس لئے گھوڑا بہت تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ تھوڑے سے فاصلہ پر ایک گہرا گڑھا تھا۔ گھوڑا اس گڑھے کی طرف جا رہا تھا۔

اقبال نے نواب اعظم یار جنگ اور اُس کے گھوڑے کو پہچان لیا۔ اس کا دل ایک لمحہ کے لئے نواب کی کج خلقی

اور بدسلوکی یاد کر کے مکدر ہو گیا - اُسے اپنی چوٹیں یاد آگئیں لیکن اس نے کمال عالی حوصلگی سے کام لیا - دشمن کی جان بچانے کی خاطر اس نے اپنی جان تک کی پرواہ نہ کی - اور گھوڑے کی طرف جھپٹا - اتنی دیر میں گھوڑا گڑھے کے کنارے پر پہنچ گیا تھا - اگر اقبال دوڑ کر اسے نہ پکڑ لیتا - تو نواب کی خیر نہ تھی - وہ گڑھے میں گر کر یقیناً مر جاتا ۔

جب اقبال نے گھوڑے کو روک لیا تو دو تین آدمی اور وہاں آ پہنچے - انہوں نے گرے ہوئے سوار کو اُٹھایا - تھوڑی دیر میں اس کے ہوش و حواس ٹھیک ہوئے - پھر اُس نے چاروں طرف دیکھ کر کہا "میری جان کس نے بچائی ہے؟ میں اپنے محسن کا شکر گذار ہوں" - اس کے دوست نے جواب دیا "نواب صاحب - آپ کی جان بچانے والا وہی لڑکا ہے - جس کو آپ نے آج صبح بے دردی سے ناحق پیٹا تھا - اگر وہ کمال بہادری سے گھوڑے کو نہ روک لیتا - تو اس وقت آپ اس گڑھے کی تہ میں گر پڑے ہوتے - گھوڑا

چھلانگ مار کر اس کو کودنا ہی چاہتا تھا۔ کہ اس بہادر اور نیک لڑکے نے آپ کی جان بچالی "۔

نواب اعظم یار جنگ ایک مغرور آدمی تھا۔ لیکن اقبال کی فراخ دلی اور اپنی سنگ دلی کا خیال کر کے وُہ شرمندہ ہو گیا۔ اس نے جیب میں سے ایک اشرفی نکالی اور اقبال کو دینی چاہی لیکن اقبال نے نہایت حقارت کے ساتھ مُنہ موڑ لیا اور کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھا کر چل دیا "۔

جب انور نے غریب آدمی کی جھونپڑی پر پہنچ کر کپڑے دیئے تو سب نے اس کو دُعائیں دیں۔ انور کو اِن غریب بچوں کی خوشی اور شکر گزاری دیکھ کر بہت مسرت حاصل ہوئی۔ فرطِ انبساط سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وُہ جلدی سے جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ راستہ میں اس نے اقبال سے کہا "جتنی خوشی مجھے آج اِن غریبوں کی مدد کرنے سے ہوئی ہے۔ خود اچھے کپڑے پہننے اور عُمدہ عُمدہ کھانے کھانے سے کبھی نہیں ہوئی۔ اِس لئے میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ

انشاء اللہ آئندہ مجھے جو کچھ جیب خرچ کے لئے ملا کریگا۔ اُس سے غریبوں کو کھانے اور پہننے کی چیزیں خرید کر دیا کرونگا"۔

گھر پہنچ کر انور اور اقبال نے سب باتیں پروفیسر صاحب کو من وعن سُنا دیں۔ جب پروفیسر صاحب نے گٹھڑی اُٹھانے کے متعلق انور اور اقبال کی گفتگو سُنی تو وُہ خوب ہنسے اور کہنے لگے "گو امیروں کے پاس روپیہ، پیسہ، سونا چاندی سب کچھ ہوتا ہے تاہم اگر غریب آدمی کام نہ کریں۔ کھیتوں میں ہل نہ چلائیں اور اناج نہ بوئیں تو امیر لوگ فاقوں مر جائیں۔ کیونکہ انسان سونے چاندی سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ چند روز ہوئے اسی مضمون کے متعلق میں نے مفصلہ ذیل کہانی پڑھی تھی:۔

دو بھائیوں کی کہانی

مقبول اور محبوب دو بھائی تھے۔ مقبول چھوٹا تھا اور محبوب

بڑا مقبول نے کسی کتاب میں پڑھا کہ ایک جزیرہ میں سونے چاندی
کی کانیں بکثرت ہیں اور بہت سے آدمی وہاں سے سیم وزر
لاکر امیر کبیر ہو گئے ہیں۔ یہی ہوس اس کو بھی دامنگیر ہوئی اور
اس نے اس جزیرہ میں جاکر قسمت آزمائی کرنے کی ٹھان لی۔
اسے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ دلی اُلفت تھی اور اس کے
بغیر وُہ بڑا کام خوشی سے نہیں کرسکتا تھا۔ اِس لیے اُس
نے اوّل اپنے بڑے بھائی سے اپنا منصوبہ بیان کیا۔ اور اصرار
کے ساتھ درخواست کی کہ آپ میرے ہمراہ چلیں جو دولت
ہاتھ آئے گی بحصۂ مساوی باہم تقسیم کرلیں گے" ۔

محجوب نہایت قانع اور دور اندیش آدمی تھا۔ اُس نے
تمام نشیب و فراز سمجھا کر کہا "اِس ارادہ میں کامیابی کی توقع
کم ہے" لیکن چھوٹے بھائی پر جب اپنی نصیحت کا اثر کچھ
نہ دیکھا تو از راہِ ہمدردی ناچار اس کی رفاقت پر آمادہ ہوگیا۔
اور کہا "میں تمہاری دولت میں شرکت نہیں چاہتا۔ مجھ کو
صرف اتنی اجازت دو کہ کھیتی باڑی کرنیکے کچھ آلات اور اسباب

اور اپنے چند نوکر ہمراہ لے چلوں۔ ممکن ہے اِس طور سے بوقتِ ضرورت تمہاری اور تمہارے رفقا کی کچھ خدمت کر سکوں"۔ مقبول نے یہ بات مان لی اور جب اسے اس بات کا اطمینان ہو گیا۔ کہ بڑا بھائی ساتھ چلے گا۔ تو اس نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ اور خوشی خوشی اپنا تمام مال و اسباب اور جائداد بیچ کر ایک جہاز خریدا ؎

جب یہ خبر مشہور ہوئی تو چند اور بوالہوس جو مقبول کی طرح مال و دولت کے حریص تھے، اُس کے ہم سفر بنے۔ محبوب بھی تمام آلاتِ کاشتکاری اور غلّہ اور ترکاریوں کے بیج جو بوروں میں بند تھے لایا۔ اور اپنے چند ملازموں سمیت مقبول کے جہاز پر جا سوار ہوا۔ اگرچہ ان سب اشیاء کا لے جانا مقبول کو محض فضول نظر آتا تھا، مگر اس اقرار کے بموجب جو پہلے ہو چکا تھا، عذر و انکار مناسب نہ سمجھا ؎

اب جہاز روانہ ہوا۔ سب نے بسم اللہ مجریہا و مرسٰھا کہا۔ خدا کے فضل سے ہوا ایسی موافق چلی کہ بحری سفر بغیر کسی

حادثہ اور مصیبت کے طے ہو گیا۔ سب لوگ بخیر و عافیت خشکی پر اُترے۔ محبوب نے کچھ بھیڑیں اور بیل خریدے اور معہ اپنے نوکروں اور آلات و اسباب کے ایک عُمدہ قطعۂ اراضی میں، جو ساحلِ بحر سے مِلحق تھا، قیام کیا اور چھوٹے بھائی سے کہہ دیا "میں نہ تو یہاں بود و باش کرنے آیا ہوں اور نہ دولت کی طمع مجھ کو یہاں لائی ہے بلکہ صرف تمہاری رفاقت کی غرض سے آیا ہوں۔ جب تم سونا لے کر واپس آجاؤ گے تو میں تمہارے ساتھ وطن کو واپس چلوں گا"۔

سونے کے مشتاقوں نے کان کھودنے والے مزدور نوکر رکھّے اور سب سامانِ ضروری مہیّا کر کے اس نواح کا قصد کیا جہاں سونا نکلتا تھا۔ اثنائے سفر میں مقبول بڑے بھائی کی سمجھ پر افسوس کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔ "دیکھو! حضرت نے بھیڑیں اور بیل خریدے ہیں۔ پردیس میں آکر کاشتکاری کا کھڑاگ پھیلایا ہے۔ ہم تو اپنا عزیز وقت یوں اکارت کرنا پسند نہیں کرتے۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو اِتنا کما لائیں گے۔

کہ کئی پشت تک کافی ہوگا" سب رفیقوں نے اِس کی فراست اور ہمّت پر آفرین کی۔ لیکن ایک پیرمرد نے، جسے سب لوگ فیروز بخت کہتے تھے۔ سر ہلا کر کہا "میاں تمہارا بھائی ایسا نہیں ہے جیسا تم خیال کرتے ہو۔ محبوب نہایت عاقبت اندیش اور عقلمند آدمی ہے"۔

غرض یہ قافلہ دریاؤں کو عبور کرتا، دشوار گذار دروں سے گزرتا، سخت بارش اور تیز دھوپ کی تکلیفیں اُٹھاتا، جا بجا کانِ زر کی جستجو میں پھرتا رہا۔ آخر "جویندہ یابندہ" ایک جگہ سونا افراط سے نکلا۔ اِس کامیابی نے مقبول اور اس کے ساتھیوں کو ایسا مسرور کیا کہ جس قدر کلفتیں اُٹھائی تھیں سب فراموش ہو گئیں۔ مدت تک وہاں کام جاری رکھا۔ لیکن غلّہ کا ذخیرہ تھوڑا تھا۔ اِس لئے خوراک میں کمی کرنی پڑی اور جب غلّہ بالکل نبڑ گیا۔ تو بھی اِن لوگوں نے دولت کی خوشی میں ہمّت نہ ہاری، جنگل کی جڑی بوٹی کھا کر دِن کاٹے اور جتنا سونا جمع کیا تھا۔ اس کو لے کر بندرگاہ کی طرف چوبن توں کر کے مراجعت

کی۔ لیکن فاقے کی صعوبت سے چند ہمراہی اثنائے راہ میں راہیِ عدم ہو گئے ۔

اس عرصہ میں محبوب نے اپنے نوکروں کی اعانت سے زراعت کا ڈول ڈالا ۔ اس کی سعی و محنت نے جس کے ساتھ سلیقہ اور تجربہ بھی شامل تھا۔ اس ویرانہ جنگل کو باغ و بہار اور لالہ زار بنا دیا ۔ خدا کی عنایت سے فصل اچھی ہوئی ہر جنس کا غلہ اور ہر قسم کی ترکاریاں بافراط پیدا ہوئیں ۔ بھیڑوں نے اتنے بچے دئے کہ ایک بڑا گلہ ہو گیا ۔ دودھ مکھن اور سبزی کی کچھ کمی نہ رہی ۔ نوکروں نے وقتِ فرصت میں سمندر کی مچھلیوں کا شکار کیا اور نمک سود کر کے ایک انبار جمع کر لیا ۔

محنت سونے سے بہتر ہے

جب مقبول محبوب کے پاس پہنچا تو اس کی اور اس کے

باقی ماندہ ہمراہیوں کی حالت بہت نازک تھی۔ دو روز سے فاقہ پر فاقہ کیا تھا۔ پہلی بات جو اِس مصیبت زدہ گروہ نے کہی وُہ کھانے کا سوال تھا۔

محبوب نے اِن کے واپس آنے سے خوشی تو ظاہر کی اَور اِن کے زندہ اور سلامت پہنچنے کی مبارک باد بھی دی۔ مگر کھانے کا سوال سُن کر ایسا روکھا جواب دیا۔ جو رشتہ داری اور ہم وطنی ہی کے خلاف نہ تھا بلکہ انسانیت اَور خدا ترسی سے بھی ظاہرا بعید معلوم ہوُا۔ اس نے کہا "سنو صاحبو! جب تمہاری دولت سے مجھ کو کچھ سروکار نہیں تو میری کمائی سے تم کو کیا واسطہ؟ جو دانہ دُنکا میں نے بفضلہٖ تعالیٰ اپنی قوّتِ بازو سے پیدا کیا ہے۔ میں کیوں مُفت دے دوں؟ اگر تم کو ایسی ہی احتیاج ہے تو سونا دو اور کھانا لو"۔

اِس کج خلقی، نامہربانی اور بے رحمی پر اُن لوگوں کو بڑا طیش آیا مگر بھوک کے مارے لبوں پر دم آ رہا تھا۔ ناچار سونے کی ڈلیاں دے کر کھانا خریدا۔ اور اپنی جان بچا لی۔ اِس طور

سے ہر روز خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اُن کا تمام سونا حوائج ضروری کے بہم پہنچانے میں صرف ہو گیا۔

جب محبوب کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا سرمایہ ختم ہو چکا ہے۔ تو اس نے کہا "آج کل موسم اچھا ہے ہوا بھی موافق چل رہی ہے بہتر یہ ہے کہ یہاں سے جہاز کا لنگر اٹھاؤ اور وطن پہنچ کر بوڑھے والدین اور اہل و عیال کی خبر لو۔ خدا جانے ان پر کیا گذری اور تمہارے انتظار میں ان بیچاروں کا کیا حال ہوا؟"

مقبول نے نہایت ملول ہو کر جواب دیا "جو کچھ اپنی جان کھپا کر اور صعوبتیں اُٹھا کر ہم نے کمایا وُہ تو سب کا سب آپ کی نذر کر چکے اب خالی ہاتھ کیا جائیں۔ اور بیگانوں کو کیا مُنہ دکھائیں۔ اور آپ جیسے سنگ دل بھائی کے ساتھ جانے سے تو یہیں مر رہنا بہتر معلوم ہوتا ہے"۔

جب یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ فیروز بخت مسکرا رہا تھا مقبول اور اس کے باقی رفقا حیران تھے کہ اس پیر مرد کو اس وقت یہ ہنسی کیوں سوجھی ہے۔ لیکن جب محبوب یہ رنج آمیز اور مایوسانہ

باتیں سن کر ہنستا ہوا اُٹھا اور سارا سونا لاکر چھوٹے بھائی اور اس کے ساتھیوں کے حوالہ کر دیا۔ تو فرطِ حیرت وانبساط سے اُن کے آنسو نکل آئے اور اب انہیں فیروز بخت کی باتوں اور محبوب کی کاشتکاری کی اہمیت معلوم ہوگئی۔ محبوب نے کہا۔ "لو تمہاری دولت تم کو مبارک ہو۔ میں اس کا خواستگار ہرگز نہیں ہوں جو بے مروّتی اور کج ادائی میں نے برتی اس میں یہ مصلحت تھی کہ تم اپنی غلطی سے متنبہ ہو جاؤ اور ہمیشہ اس نصیحت کو یاد رکھو کہ محنت سونے سے بہتر ہے"۔

آخرکار سب لوگ خوش وخرم اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ مقبول نے گھر پہنچ کر چاہا کہ اپنے سونے میں سے نصف حصہ بڑے بھائی کو دے۔ مگر عالی ہمت محبوب نے پھر وہی جواب دیا:-

"محنت سونے سے بہتر ہے"

جب پروفیسر صاحب کہانی سنا چکے تو انور نے کہا:- "بیشک محبوب دانا آدمی تھا۔ اگر وہ محنت نہ کرتا تو اُس کا چھوٹا بھائی اور اس کے رفیق فاقوں مرجاتے۔ لیکن ہندوستان

میں ایسی باتیں ممکن نہیں ہیں۔ یہاں تو پیسہ والے کو کسی چیز کی کمی نہیں"

پروفیسر صاحب "میاں انور۔ ابھی تم بچہ ہو۔ ناتجربہ کار ہو۔ یہ باتیں تم بخوبی نہیں سمجھ سکتے۔ آدمی ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا۔ ہزاروں لاکھوں آدمی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ اور آئے دن جہاز غرق ہوتے رہتے ہیں۔ آدمی کو چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے برے وقت کو کبھی نہ بھولے اور کچھ نہ کچھ ہنر ضرور سیکھ لے جو آڑے وقت کام آئے۔ جب تم بڑے ہو گے تو تم ایک انگریزی کتاب "رابنسن کروسو" پڑھو گے یہ کتاب بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس کے مطالعہ سے تمہیں بہت سی مفید معلومات حاصل ہوں گی۔ بالخصوص اس بات کا پتہ چلے گا کہ ایک ہنرمند اور ہوشیار آدمی مصیبت کے وقت بھی نہیں گھبراتا۔ بلکہ مصائب کا مقابلہ جوانمردی سے کرتا ہے۔ اور جو کچھ میسّر ہوتا ہے اس سے اپنی جان کی حفاظت کر لیتا ہے۔

"رابنسن کروسو کا جہاز ایک غیر آباد جزیرہ کے نزدیک

غرق ہوگیا تھا۔ اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ اُس نے
اپنی زندگی کے کئی سال اکیلے وہاں کس طرح گزارے"۔

"اس کے علاوہ تمہیں ایک اور بات بھی ذہن نشین
کرلینی چاہیئے۔ ہماری دُنیا کے بعض حصّوں میں چھ مہینے دن اور
چھ مہینے رات رہتی ہے۔ اِن ملکوں میں سُورج چھ مہینے تک
مسلسل اُفق کے اُوپر رہتا ہے اور برابر چھ مہینے اُفق سے نیچے
نظر سے غائب رہتا ہے۔ جغرافیہ کی کتابوں میں تم منطقہ باردہ
اور قطبین کے پاس کی زمینوں اور سمندروں کے حالات مفصّل
طور پر پڑھوگے۔ طویل شبِ تار کے علاوہ وہاں کے باشندوں
کو شدید سردی کا سامنا ہوتا ہے۔ تمام ملک سال بھر برف
سے پٹا رہتا ہے۔ مایع پانی وہاں میسر نہیں ہوتا۔ پینے کے لئے
برف پگھلا کر پانی بنایا جاتا ہے۔ رو ئیدگی نام کو بھی نہیں ہوتی۔
پوشش حاصل کرنے کے لئے بھی انہیں بہت کچھ ہاتھ پاؤں
مارنے پڑتے ہیں۔ غرضیکہ وہاں کے باشندوں کو ہندوستانیوں
کی سی خدا داد نعمتیں اور آسانیاں حاصل نہیں ہیں۔ ضرورت

ایجاد کی ماں ہے یہ تمہیں یہ سُن کر ضرور حیرت ہو گی کہ با وجود ان مصائب اور قدرتی تکالیف کے وہ جفاکش لوگ سفّاک نیچر پر غالب آ گئے ہیں۔ اور اُنہوں نے اپنے آرام و آسائش کے لئے جملہ حوائج ضروری بہم پہنچا لی ہیں، وہ وہاں بالکل خوش و خورم ہیں" ۔

محبت کے کرشمے

اگلے روز اقبال اپنے گاؤں گیا اور وہاں سے اپنے ساتھ وہ چوزہ، جو اس نے چیل کے پنجے سے چھڑایا تھا لیتا آیا - چوزہ اس سے ایسا ہل گیا تھا کہ کتّے کی طرح اُس کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا - اس کے کندھے پر آ بیٹھتا تھا اور اُس کے ہاتھ پر سے دانہ اُٹھا کر کھا جاتا تھا - انور یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا - اس نے کہا "میرا خیال تھا کہ تمام جانور انسانوں سے ڈرتے ہیں"۔ پروفیسر صاحب نے کہا "تم

اِس کا سبب کیا سمجھتے ہو؟"

انور "اِس لئے کہ وہ وحشی ہوتے ہیں" ؎

پروفیسر صاحب "کسی جانور کے وحشی ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

انور "میں جانوروں کو وحشی اِس لئے کہتا ہوں کہ وُہ آدمیوں کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے" ؎

پروفیسر صاحب "خوب۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ جانور تمہیں اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ اور چونکہ وُہ تمہیں اپنے پاس نہیں آنے دیتے اِس لئے وُہ وحشی ہیں۔ یہ منطق عجیب ہے۔ اِس فقرہ سے تمہارا مافی الضمیر واضح نہیں ہوتا۔ میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ جانوروں کے وحشی ہونے کا اصلی سبب کیا ہے؟ بالفاظِ دیگر تم یہ بتاؤ کہ جانور آدمیوں کو اپنے پاس کیوں نہیں آنے دیتے؟"

انور "جناب۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ جانور پیدائشی طور پر وحشی ہوتے

ہیں" ۔

پروفیسر صاحب:- "لیکن یہ تو سوچو کہ اگر جانور فطرتاً وحشی ہوتے تو یہ چوزہ اقبال سے کیوں ہل جاتا؟"

انور:- "یہ چوزہ اقبال سے اِس لئے مانوس ہے کہ اقبال اس سے اچھا سلوک کرتا ہے" ۔

پروفیسر صاحب:- "شاباش۔ اِس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جو آدمی جانوروں پر مہربان ہوتے ہیں اور اُن سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ اُن سے جانور نہیں بھاگتے۔ اس لئے صحیح نتیجہ یہ نکلا کہ جانور انسانوں سے غالباً اِس لئے بھاگتے ہیں کہ انسان اُن سے بُرا سلوک کرتے ہیں یا انہیں انسانوں سے بُرے سلوک کا اندیشہ ہوتا ہے۔ حضرتِ انسان کے پیہم ظلم اور جور و تعدی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جانور جبلی طور پر آدمیوں سے خائف اور گریزاں رہتے ہیں۔ اِسی طرح میں خیال کرتا ہوں کہ اگر کوئی شیر یا چیتا یہاں آجائے۔ تو تم فوراً ڈر کر بھاگ جاؤ" ۔

انور "جی ہاں فوراً"

پروفیسر صاحب "پھر کیا سبب ہے کہ تم اپنے آپ کو وحشی نہیں کہتے ؟"

انور یہ دلیل سن کر خوب ہنسا۔ پھر پروفیسر صاحب نے اسے سمجھایا کہ "اگر تم جانوروں سے نیک سلوک کرو اور انہیں خوب کھلاؤ پلاؤ اور کسی قسم کی تکلیف نہ دو تو وہ تم سے ضرور مانوس ہو جائیں گے اور ڈر کر نہیں بھاگیں گے" انور اس گفتگو سے بہت خوش ہوا۔ اس کو ہر ایک بات آزمانے اور تجربہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے اس نے ارادہ کیا کہ وہ آج ہی سے جانوروں کو اپنے ساتھ مانوس کرنا شروع کر دے۔ چنانچہ اس نے اپنے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس تلاش میں باہر نکلا کہ کوئی جانور ملے تو اسے اپنے ساتھ مانوس کر لے۔ ابھی کچھ دور نہیں گیا تھا کہ اس نے ایک بچھڑے کو اپنی ماں کے ساتھ کھیت میں چرتے ہوئے دیکھا۔ انور نے زور سے کہا "بچھڑے۔ میرے اچھے بچھڑے۔ یہاں

آؤ۔ میں تمہیں روٹی کھلاؤں گا" بچھڑا انور کو دیکھ کر بھاگ گیا۔ انور کو غصّہ آگیا اور کہنے لگا " بدمعاش! کیا تم مجھ سے بھاگتے ہو۔ حالانکہ میں تمہیں روٹی کھلانا چاہتا ہوں۔ تم ناشکرے ہو۔ خیر۔ میں تمہیں ابھی بتا دوں گا کہ میں درحقیقت تم سے نیک سلوک کرنا چاہتا ہوں" یہ کہہ کر اُس نے بچھڑے کی پچھلی ٹانگ زور سے پکڑنی چاہی۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ ٹانگ پکڑ اُس کے مُنہ میں روٹی ڈالے۔ لیکن جونہی کہ اُس نے بچھڑے کی پچھلی ٹانگ کو ہاتھ لگایا۔ اس نے انور کو زور سے ایک لات ماری اور انور زخمی ہو کر نیچے گر پڑا۔

پروفیسر صاحب دُور سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ جب وہ قریب آئے تو انور نے کہا "جناب۔ میری یہ گت محض آپ کی باتیں سُننے سے بنی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اِس بچھڑے سے محبّت کروں۔ اور یہ مجھ سے مانوس ہو جائے۔ میں اس کے لئے روٹی کا ٹکڑا لایا تھا۔ لیکن نتیجہ میری مرضی کے خلاف ہوا ہے" پروفیسر صاحب نے کہا "میں اُمید کرتا

ہوں کہ تمہیں زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ تم کو بخوبی سمجھ لینا چاہیئے۔
کہ جانوروں کو مانوس کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ جھٹ پٹ
ان کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیں۔ پہلے ان کی عادتوں
اور ضروریات سے واقفیت حاصل کرنا چاہیئے۔ پھر رفتہ
رفتہ ان کو ہلانا چاہیئے۔ اگر تم کو صحیح طریقہ معلوم ہوتا۔ تو تم ہرگز
بچھڑے کی ٹانگ کو پکڑنے کی کوشش نہ کرتے۔ جب ہم لاہور
جائیں گے تو میں تم کو "سرکس" کا تماشہ دکھلاؤں گا۔ وہاں تم
دیکھو گے کہ نہ صرف معمولی پالتو جانور بلکہ شیر اور ہاتھی کو بھی
سدھا لیا ہے! اور ان سے عجیب و غریب کرتب کراتے
ہیں۔ شیر اور بکری ایک برتن میں سے دودھ پیتے ہیں ہاتھی
کتے کی طرح اپنی اگلی دو ٹانگیں اوپر اٹھا کر سلام کرتا ہے۔
شیر آگ کے حلقہ میں سے پھلانگ کر نکل جاتا ہے" ؛
انور کو یہ باتیں سن کر بہت حیرت ہوئی! اور اس نے کہا
"کیوں جناب! شیر تو اتنا خونخوار جانور ہے اور ہاتھی اس قدر
بڑا ہوتا ہے کہ اس کی ٹانگیں بالکل ستونوں کی طرح ہوتی ہیں۔

اس کے کان دو بڑے چھاج معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا سدھانا بہت مشکل ہوگا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ہاتھی کو مانوس کرنا بہت محنت کا کام ہوگا"۔ پروفیسر صاحب نے کہا "محنت کا کام کیوں نہیں۔ محنت کے بغیر دنیا میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب ایک دفعہ ہاتھی مانوس ہو جاتا ہے۔ تو پھر بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ شیر اور دیگر بڑے جانوروں کا شکار ہاتھی پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے بلکہ سدھائے ہوئے ہاتھیوں کی مدد سے جنگلی ہاتھی بھی پکڑے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب ہاتھی ناراض ہوتا ہے۔ تو بہت خطرناک جانور ہوتا ہے۔ تم نے ہاتھی اور درزی کا قصہ پڑھا ہوگا۔ لیکن تمہارے کپڑے خاک آلود ہو رہے ہیں۔ اب تمہیں گھر جا کر نہانا چاہیئے"۔

جب انور نہا چکا تو اقبال نے کہا "آج چونکہ انور کو چوٹ لگی ہے۔ اس لئے ہم سیر کو نہیں جائیں گے بلکہ گھر میں بیٹھ کر کہانیاں سنیں گے"۔ پروفیسر صاحب نے اُن کی یہ درخواست منظور کر لی۔ اور انور کو ایک کتاب دی۔ جس میں سے اُس نے

یہ کہانی پڑھیں :۔

ایک نیک لڑکا

نثار احمد ایک نیک لڑکا تھا۔ اس کا باپ ایک متقی، پرہیزگار اور نیکوکار بزرگ تھا۔ باپ کی نیک مثال اور اعلیٰ تربیت سے نثار احمد اخلاقِ حسنہ کا زندہ مجسمہ بن گیا تھا۔ ایک دن وہ اپنے گھر سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں جانے کے لئے صبح سویرے روانہ ہوا۔ اس کے پاس ایک ناشتہ دان تھا۔ جس میں دوپہر کا کھانا رکھا تھا۔ نثار ابھی تھوڑی دور گیا تھا۔ کہ ایک چھوٹا سا کتا، دم ہلاتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر یوں دیکھنے لگا۔ گویا کہ اپنی زبانِ حال سے کہتا ہے "میں بھوکا ہوں، مجھ پر رحم کرو اور کھانے کے لئے کچھ دو" پہلے تو نثار نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد

اُسے اس کی خستہ حالت دیکھ کر ترس آ گیا۔ اُس نے اپنے دل میں سوچا "اگر میں اس جانور کو اپنے ناشتہ میں سے کچھ حصّہ دے دوں گا تو مجھے بھوکا رہنا پڑیگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بھوکا ہے۔ اِس لئے مجھے ضرور اس کی مدد کرنی چاہیئے" یہ سوچ کر اس نے ناشتہ دان میں سے دو روٹیاں نکال کر کتّے کے آگے ڈال دیں۔ کتّا ان کو اس طرح کھا گیا جیسے کہ وہ دس دن کا بھوکا تھا۔ جب اس کے پیٹ میں رونق ہو گئی۔ تو کتّا دم ہلاتا ہوا نثار کے پیچھے پیچھے چلدیا۔

پانچ میل چلنے کے بعد نیک لڑکے کو ایک مریل بوڑھا گھوڑا زمین پر پڑا ہوا دکھائی دیا۔ گھوڑا بہت بیمار اور بھوکا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس قدر کمزور اور ناتواں تھا کہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر گھاس بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ نثار نے سوچا "اگر میں اس گھوڑے کی مدد کرنے کے لئے یہاں ٹھہر گیا تو مجھے راستہ ہی میں شام ہو جائے گی۔ میں نے سُنا ہے کہ رات کے وقت چور پاس کے جنگل سے نکل کر مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ لیکن اس

وقت اس گھوڑے کی حالت قابل رحم ہے۔ اس لئے میں خدا کا نام
لے کر اس کی مدد کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ واپسی پر میرا
خدا اندھیرے میں میری حفاظت کریگا" یہ سوچ کر نثار نے
تھوڑی سی گھاس نوچ کر گھوڑے کے منہ میں ڈالی۔ گھوڑے
نے اس کو بہت رغبت سے کھایا۔ گھاس کھانے کے بعد
گھوڑے کو ہوش آ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی اصلی بیماری
بھوک تھی۔ پھر نثار نے سوچا کہ گھوڑے کو پانی بھی پلانا چاہیئے
لیکن اسے کوئی برتن نہ ملا۔ آخر کار اس کو اپنے ناشتہ دان
کا خیال آیا۔ ناشتہ دان میں سے اپنا کھانا نکال کر زمین پر رکھ
دیا۔ اور اسے پانی سے بھر کر گھوڑے کے پاس لایا۔ پانی پینے
کے بعد گھوڑے کی جان میں جان آ گئی۔ اور وہ کھڑا ہو کر
گھاس چرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی ۔

نیک دل نثار پھر آگے بڑھا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ
اس نے ایک آدمی کو ایک گڑھے میں جو پانی سے بھرا ہوا تھا
ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دیکھا۔ وہ باہر نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن اس

کی تمام کوششیں بے سود تھیں۔ نثار نے یہ دیکھ کر کہا "صاحب کیا اس گڑھے میں سے آپ باہر نہیں نکل سکتے ؟" اُس آدمی نے جواب دیا۔ "صاحبزادے۔ خدا تمہارا بھلا کرے میں نابینا ہوں۔ غلطی سے پانی کی طرف چلا آیا اور گڑھے میں گر پڑا۔ اب مجھے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا" نثار نے کہا "گو میرے کپڑے سب بھیگ جائیں گے" تاہم اگر تم اپنی لاٹھی میری طرف پھینکو تو میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرونگا" اندھے آدمی نے اپنی لاٹھی اس طرف پھینکی جدھر سے اُسے آواز آتی تھی۔ رحم دل نثار لاٹھی ٹیکتا ہوا پانی میں گھس گیا۔ لاٹھی کی مدد سے وُہ پانی کی گہرائی ناپتا جاتا تھا تا کہ زیادہ گہرے پانی میں ڈوب نہ جائے۔ آخر کار وہ اندھے آدمی کے پاس پہنچ گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا۔ کنارے پر پہنچ کر اندھے آدمی نے نثار کو ہزاروں دعائیں دیں اور کہا کہ اب میں اپنا راستہ ٹٹول کر اپنی کٹیا پر جو یہاں سے جنگل میں ہے پہنچ جاؤں گا۔ گو نثار کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ لیکن اندھے آدمی کی دعائیں سُن کر

اس کی کلفت مبدل بہ راحت ہوگئی ﷺ
نثار تیز قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھا لیکن ابھی وُہ بہت دُور نہیں گیا تھا کہ اس نے ایک غریب سپاہی کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے دیکھا - مجروح سپاہی نے کہا "صاحب زادے! خدا تمہارا بھلا کرے - مجھے کھانے کے لئے کچھ دو - تم دیکھتے ہو کہ لڑائی میں میری دونوں ٹانگیں کٹ گئی ہیں - بے خانماں اپاہج ہوں - کئی دِنوں سے پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملا - اور اللہ شاہد ہے دو روز سے فاقے پر فاقہ آرہا ہے اس وقت میں بھوک سے مر رہا ہوں" نثار کے دِل میں ترس آیا - اُس نے اپنا سارا ناشتہ سپاہی کو دیدیا - اور کہا "بھلے آدمی! خدا تمہاری مدد کرے - میرے پاس یہی کچھ ہے اِسے کھا لو - اگر میرے پاس اور زیادہ کھانا ہوتا تو وُہ بھی تمہیں دے دیتا" ﷺ

نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی

نیکی کے ان کاموں میں نثار کو بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا گاؤں پہنچا اور جلدی سے وہاں اپنا کام ختم کر کے گھر واپس لوٹا۔ وہ بہت تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ لیکن ابھی اس نے نصف راستہ طے کیا تھا کہ رات ہو گئی رات اندھیری تھی اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ گھبراہٹ کے مارے نثار راستہ بھول گیا۔ اور بھٹکتا ہوا ایک جنگل میں جا پہنچا۔ وہ چاروں طرف ڈھونڈتا پھرا۔ لیکن اسے کوئی راستہ نہ ملا۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر اور تھک ہار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اور زار زار رونے لگا۔

نثار کو جنگل میں بیٹھے ہوئے تھوڑی سی دیر گذری تھی کہ وہی چھوٹا کتا دم ہلاتا ہوا اس کے پاس آیا۔ وہ اپنے منہ میں کوئی چیز دبائے ہوئے تھا۔ جس کو اس نے نثار کے

کے سامنے زمین پر گرا دیا۔ نثار نے اُٹھا کر دیکھا تو ایک رومال میں بہت سے روٹی کے ٹکڑے اور بھنا ہوا گوشت بندھا تھا۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ سے نثار کی بھوک چمک اُٹھی۔ اُسے کتے کے منہ سے نکلی ہوئی چیز کھانے میں تامل تھا۔ لیکن رومال خشک تھا اور کھانا کتے کے لعاب دہن سے بالکل پاک صاف تھا۔ پس اس نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پھر اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہنے لگا "اچھے کتے! تم نے مجھے اتنے کے عوض کھانا کھلایا اور مجھے یہ بات سکھائی ہے کہ نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی خواہ وہ کتے کے ساتھ ہی کیوں نہ کی جائے"۔

نثار کھانا کھا کر تازہ دم ہو گیا۔ اس لئے اس نے پھر جنگل میں سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اُسے اپنی ٹانگیں زخمی کرنے اور ادھر اُدھر بھٹکنے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ ہار کر وہ دوبارہ بیٹھنے ہی کو تھا کہ بادلوں کے پیچھے چاند چمکا اور اس کی روشنی میں اسے ایک گھوڑا گھاس چرتے ہوئے نظر آیا۔ نثار نے قریب آ کر دیکھا تو اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی گھوڑا ہے جس کو صبح

میں نے گھاس اور پانی پلایا تھا۔ نثار کے دل میں خیال آیا کہ شاید کتے کی طرح یہ گھوڑا بھی مجھے میری نیکی کا نیک اجر دے۔ اور مجھے اپنی پیٹھ پر بیٹھا کر جنگل سے باہر لے جائے کیونکہ یہ یہاں کے راستوں سے ضرور واقف ہوگا۔ یہ سوچ کر نثار گھوڑے کے پاس گیا۔ اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اس کے اوپر چڑھ بیٹھا گھوڑا نثار کو پہچان کر خوشی سے ہنہنایا اور چپ چاپ اُس کو اپنی پیٹھ پر چڑھنے دیا اور آہستہ آہستہ اسے جنگل میں سے باہر لے آیا۔ جب نثار شاہراہِ عام پر پہنچا تو اس نے اپنے دل میں سوچا۔ اگر میں آج صبح اس جانور کی جان نہ بچاتا تو مجھے تمام رات یہیں رہنا پڑتا۔ سچ ہے نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی۔

اب نثار مطمئن تھا کہ بخیر اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ وہ سڑک پر تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ دو آدمی اس پر جھپٹے اور اُس کے کپڑے اُتارنے لگے۔ عین اس وقت چھوٹے کتے نے اُن میں سے ایک کی ٹانگ کو ایسے زور سے کاٹا کہ وہ نثار کو چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگا۔ اسی وقت آواز سنائی

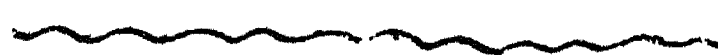
دی۔ ''چور! چور! وُہ جا رہے ہیں۔ پکڑ لو'' یہ سُن کر دُوسرا آدمی بھی بھاگ گیا۔ نثار نے دہشت سے آنکھیں بند کر لی تھیں جب چور بھاگ گئے تو اس نے آنکھیں کھولیں اور حیرت و استعجاب سے دیکھا کہ چوروں کو بھگانے والا اُس کے صبح والے دوست تھے۔ جن کی مدد اس نے کی تھی۔ لُنجا سپاہی اندھے آدمی کے کندھے پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس نے کہا ''صاحب زادے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے اور اپنے محسن کی مدد کر سکے۔ میں ایک جھاڑی کے پاس لیٹا ہُوا تھا۔ وہاں سے میں نے اِن بدمعاشوں کی باتیں سُنیں۔ یہ ایک چھوٹے لڑکے کو لوٹنے کی تجویز کر رہے تھے۔ مجھے شبہ ہُوا کہ شاید وُہ تمہیں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ نیک اندھا آدمی مجھے اس وقت وہاں نہ ملتا اور مجھے اپنے کندھے پر بٹھا کر نہ لاتا تو ہم تمہاری مدد نہ کر سکتے''۔

نثار نے بڑے تپاک سے اِن دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ سب نثار کے گھر گئے۔ سب لوگ نثار کی کہانی سُن کر

بہت خوش ہوئے۔ نثار کے والد ماجد نے بُڈھے سپاہی اور اندھے آدمی کی بہت خاطر تواضع کی اور ضعیف گھوڑے کو خدمت کے لئے ایک ملازم مقرر کر کے ایسے چراگاہ میں کھلا چھوڑ دیا۔ نثار اپنے وفادار کتّے کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا اور جہاں موقع ملتا دوسروں کے ساتھ نیکی کرتا تھا ۔

کہانی پڑھنے کے بعد انور نے کہا "سبحان اللہ! کیسی دلچسپ اور نتیجہ خیز کہانی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں۔ غالباً یہ حکایت سچی ہے۔ نثار بہت خوش بخت تھا کہ اسے اپنے نیک کاموں کا اجر بہت جلدی مل گیا" ۔

دوسرے دن پروفیسر صاحب نے کہا "کل تم نے ایک نیک فطرت لڑکے کی کہانی پڑھی تھی۔ آج ایک شریر لڑکے کی کہانی پڑھی تھی۔ آج ایک شریر لڑکے کی کہانی پڑھو اور اس سے عبرت حاصل کرو ۔



ایک شریر لڑکا

اطہر ایک شریر لڑکا تھا۔ ماں باپ نے اُس کا نام تفاولِ حسنہ کی بناء پر اطہر رکھا تھا۔ اطہر کے معنی بہت پاکیزہ اور نیک پاک ہیں لیکن محض اچھے نام رکھنے سے بچے نیک نہیں بن جاتے بچوں کے اخلاق کی درستگی کے لیے حسن تربیت اور نیک مثال کی جادو اثری درکار ہوتی ہے۔ اطہر کا باپ بہت بدمزاج اور تند خو تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو کبھی نیک ہدایت نہ کی تھی اور نہ انہیں نیک عادتیں سکھائی تھیں۔ باپ کی بدمزاجی دیکھ کر اطہر بلا کا جھگڑالو، غصہ ور اور بدمزاج ہوگیا تھا۔ اس کی سیرت میں پاکیزگی کا نام و نشان نہ تھا اور اب تو اس کی یہ حالت تھی کہ سوائے نام کی پاکیزگی کے اس میں بدی اور شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ "برعکس نہند نام زنگی کافور" کی وہ ایک زندہ مثال تھی۔ کیونکہ اُس

کی بدکرداری اور نام (اطہر یعنی پاکیزہ) میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جیسے کہ اگر کسی سیاہ حبشی کا نام کافور رکھ دیں تو اس کی سیاہ رنگت اور نام (سفید کافور) میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

بسا اوقات اطہر محلہ کے لڑکوں سے لڑتا جھگڑتا لیکن چونکہ دل کا بودا تھا اس لئے سامنے کھڑے ہو کر مقابلہ کرنے کی بجائے بزدلوں کی طرح بھاگ جاتا۔ اس کے پاس ایک کتا تھا۔ جس کا نام اس نے "ٹامی گر" رکھا تھا۔ کتا بھی مالک کی طرح بدنما اور شریر تھا۔ اس لئے سب لوگ اس کو بھی ناپسند کرتے تھے۔

ایک دن اطہر کے باپ نے اس سے کہا "مجھے آج ایک ضروری کام کے لئے قریب کے گاؤں میں جانا ہے بمشکل شام تک واپس آ سکوں گا۔ تمہارا جی چاہے تو گھر میں بیٹھ کر پڑھتے رہنا ورنہ کھیتوں میں سیر و تفریح کے لئے نکل جانا۔"

اطہر یہ بات سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے دل میں سوچا۔

آج بہت لطف رہے گا۔ سارا دن چھٹی رہے گی اور دل جمعی سے کھیل کود سکیں گے" جونہی کہ اس کا باپ گھر سے نکلا اس نے کتے کو ساتھ لیا اور سیر کے لئے باہر نکل گیا۔

ابھی اطہر تھوڑی دور ہی گیا تھا۔ کہ اس نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو بھیڑوں کا ریوڑ ہانکتے ہوئے دیکھا۔ لڑکا یہ کوشش کر رہا تھا کہ بھیڑیں ایک پھاٹک میں سے گذر کر احاطہ کے اندر چلی جائیں۔ اس لئے اس نے اطہر کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر کہا "بھائی صاحب! ذرا اپنے کتے کو روکے رکھئے۔ ایسا نہ ہو کہ میری بھیڑیں ڈر جائیں" بدفطرت اطہر نے جواب دیا "جی ہاں تمہارے باوا کا نوکر ہوں کہ تمام دن یہاں کھڑا رہوں۔ جب تک تم اور تمہاری بھیڑیں گذر نہ جائیں۔ ٹائی گر جا ٹائی گر دوڑو اور انہیں پکڑلو" یہ سن کر کتا ریوڑ کے بیچ میں کود پڑا اور بھونک کر بھیڑوں کو ڈرا دیا۔ وہ بھیڑوں کو کاٹتا تھا اور اپنے شریر مالک کی طرح اس ایذا رسانی سے خوش ہوتا تھا۔ لیکن اس کی خوشی کا خاتمہ خراب ہوا۔ بھیڑوں کو کاٹتے ہوئے

اس نے غلطی سے ایک مینڈھے کو، جو دوسروں کی نسبت زیادہ بہادر تھا۔ کاٹا۔ مینڈھے نے دم دبا کر بھاگنے کی بجائے کتّے کا مقابلہ کیا اور اس کو ایسے زور سے ٹکّر ماری کہ وُہ نیچے گِر پڑا۔ پھر تو اس نے کتّے سے خوب ہی بدلہ لیا۔ یہاں تک کہ ٹائی گر چیختا چلاتا ایک جھاڑی میں چھپ گیا۔

شریر لڑکے کے دل میں کسی چیز کی محبّت نہ تھی۔ وہ تو صرف شرارت سے خوش ہوتا تھا۔ اس کو ٹائی گر کے پٹنے اور چیخنے چلانے سے ویسی خوشی حاصل ہوئی جیسی کہ بھیڑوں کے خوفزدہ ہو کر بھاگنے سے ہوئی تھی۔ اس لئے وُہ اسکی حالت زار دیکھ کر اس کی مدد کرنے کی بجائے اپنی جگہ پر کھڑا ہنستا رہا۔ شاید وُہ ابھی اور ہنستا لیکن چرواہے کے لڑکے سے رہا نہ گیا اُس نے ایک پتّھر اُٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ وُہ پتّھر ایسا نشانہ پر لگا کہ اطہر کی پیشانی سے خون پھُوٹ نکلا اور اُس نے اپنے کتّے کے ساتھ سُر مِلا کر رونا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ وُہ

غالباً بھیڑوں کا مالک ہے۔ اِس لئے وہ اپنے گتّے کو وہیں چیختا چلاتا چھوڑ کر بھاگ گیا۔

ابھی اس کا درد کم نہیں ہوا تھا کہ اُس کی شیطنت نے پھر جوش مارا۔ اس نے اپنے جی میں ٹھانا۔ کہ جہاں تک ہو سکے کوئی مزیدار شرارت کرے۔ اِس خیال کے دِل میں آنے کے بعد وہ ابھی تھوڑی دُور آگے بڑھا تھا کہ اسے ایک لڑکی سڑک کے کنارے کھڑی دکھائی دی۔ اس کے پاس دودھ سے بھرا ہوا ایک بڑا سا برتن رکھا تھا۔ لڑکی نے اطہر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا "اچھے بھائی۔ مہربانی کر کے یہ برتن میرے سر پر رکھوا دو۔ میری امّاں جان نے مجھے اس کے لانے کا حکم دیا تھا۔ اور میں اسے ایک میل سے اپنے سر پر رکھ کر لائی ہوں۔ اب میں تھک گئی ہوں لیکن مجھے جلد گھر پہنچنا چاہئیے نہیں تو امّاں جان بہت خفا ہوں گی۔ ہمارے ہاں چچا چراغ محمود اور ان کے اہل و عیال مہمان ہیں۔ آج شام کو ضیافت ہے اور اس دودھ سے اُن کے لئے

فیرنی بنے گی۔ اطہر نے کہا "بہت خوب! تمہارے چچا اور ان کے بال بچے فیرنی کھا کر بہت خوش ہوں گے۔ اس لئے یہ لو۔ میں برتن تمہارے سر پر رکھتا ہوں"۔ کہنے کو تو اس نے برتن لڑکی کے سر پر رکھا۔ لیکن شرارت سے اس کو دھکا دے کر گرا دیا اور بہانہ یہ کیا کہ پاؤں پھسل گیا ہے۔ بیچاری لڑکی دودھ کو زمین پر بہتا دیکھ کر رو رہی تھی مگر یہ شریر لڑکا یہ کہہ کر ہنستا ہوا بھاگ گیا "چھوٹی بیگم صاحبہ! اپنے چچا جان کو میرا آداب عرض ضرور کہنا"۔

اس شرارت سے اطہر کا دل بڑھ گیا۔ اس نے سوچا کہ مجھے اس مرتبہ اس شرارت کی کوئی سزا نہیں ملی۔ اس لئے وہ اپنی دانائی پر بہت خوش ہوا۔ تھوڑی دور جا کر اسے چند لڑکے ایک میدان میں کھیلتے ہوئے ملے۔ اس نے ان کے ساتھ مل کر کھیلنا چاہا۔ انہوں نے بطیب خاطر اسے اجازت دے دی۔ لیکن اس کو شرارت کئے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ اس لئے اس نے گیند کو اٹھا کر سیدھی طرف پھینکنے کی بجائے پانی

سے بھرے ہوئے ایک گڑھے میں پھینک دیا۔ سب لڑکے دوڑے ہوئے گڑھے کے پاس گئے۔ پھر اطہر نے کہا کہا کہ سب سے پیچھے والے لڑکے کو دھکا دے دیا۔ وُہ پاس والے لڑکے پر گرا۔ اور پاس والا اپنے پڑوسی پر گرا۔ اِس طرح کئی لڑکے گڑھے میں اوندھے گر پڑے۔ ان کی یہ بُری حالت دیکھ کر اطہر خوب ہنسا اور وہاں سے بھاگ گیا ۔

اس کے بعد اسے فاقوں کا مارا ہؤا ایک گدھا دکھائی دیا۔ اطہر نے سوچا کہ اسے ستانے کا اچھا موقعہ ہے۔ میدان خالی ہے اور کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ یہ سوچ کر اُس نے بہت سے کانٹے جمع کئے اور اس کی دُم کے ساتھ باندھ دیئے۔ پھر اسے ڈرا کر بھگایا۔ یہ شرارت کر کے اطہر بہت خوش ہؤا چونکہ وہ صبح سے پیدل چل رہا تھا۔ اِس لئے آرام کرنے کی خاطر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا اور اپنی جیب سے بسکٹ نکال کر کھانے لگا ۔

اسے وہاں بیٹھے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ کہ

ایک غریب اندھا آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا ادھر سے گذرا۔ اطہر نے شرارتاً کہا "بڈھے میاں۔ سلام علیکم۔ کیا تم نے ایک چھوٹی لڑکی کو جس کے سر پر انڈوں کی ٹوکری تھی، اس طرف سے گذرتے ہوئے دیکھا ہے؟" اندھے آدمی نے جواب دیا۔ "صاحبزادے۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ میں نابینا ہوں میرے لئے زمین اور آسمان میں تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا" اگرچہ اس غریب آدمی کی حالت قابل رحم تھی، تاہم اطہر اس کے ساتھ مذاق کرنے سے نہ چوکا۔ جھوٹے مکار نے تصنع سے کہا۔ "مجھے تمہاری حالت پر بہت افسوس آتا ہے میں ناشتہ کر رہا ہوں۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں اس میں سے کچھ دوں گا" اندھے آدمی نے کہا "خدا تمہارا بھلا کرے مجھے اپنا ہاتھ پکڑاؤ تاکہ میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں" اطہر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور راستہ دکھانے کے بہانہ سے اُسے سڑک کی طرف لے جا کر گیلے گوبر کے ڈھیر پر بٹھا دیا اور کہنے لگا "اب تم بہت آرام سے بیٹھ گئے ہو، یہ لو۔ تھوڑا سا بسکٹ کھاؤ"

اندھے آدمی کو اِس دھوکہ بازی سے بہت غصہ آیا۔ جب اطہر نے اس کے مُنہ میں بسکٹ ڈالا تو اس نے اس کی انگلیاں اپنے دانتوں میں خوب زور سے دبالیں۔ پھر تو اطہر بلبلا اُٹھا اور خُدا کا واسطہ دے کر رحم اور معافی کی درخواست کرنے لگا۔ جب وُہ کافی رو چکا تو اندھے آدمی نے اس کی اُنگلیاں چھوڑ دیں اور کہا " بدمعاش پاجی! کیا تم کو شرم نہیں آتی۔ کہ جس آدمی نے تم کو مطلقاً کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تم اس کو ناحق تکلیف دیتے ہو؟ مردود کہیں کے۔ کیا تم کو اِتنا بھی ترس نہیں آتا۔ کہ جو پہلے سے مصیبت زدہ اور دُکھی ہیں۔ انہیں ستانا نہیں چاہیئے۔ اگرچہ میں نے تمہیں اس وقت چھوڑ دیا ہے لیکن کان کھول کر سُن رکھو کہ اگر تم نے اپنے اطوار نہ سدھارے اور توبہ نہ کی۔ تو تم کو تمہاری بدکرداری کی بہت سخت سزا ملے گی۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی

شاید اس کہانی کے پڑھنے والوں کو یہ خیال آئے کہ ایسی سخت سزا پانے کے بعد اطہر اپنی کرتوتوں سے باز آ گیا ہوگا۔ لیکن نہیں وہ ایسا بدنہاد اور نابکار تھا کہ اسے شرارت کئے چین نہیں آتا تھا۔ وہ چند قدم آگے گیا تھا کہ اسے ایک لنگڑا فقیر ملا، جو دو لاٹھیوں کے سہارے بڑی دقت سے چل رہا تھا۔ فقیر نے خدا کے نام پر کچھ مانگا۔ اور اطہر نے جیب سے ایک اکنّی نکال کر اس کے سامنے پھینک دی گویا کہ وہ اسے دینا چاہتا ہے۔ لیکن جب غریب آدمی بڑی تکلیف کے ساتھ اُسے اُٹھانے کے لئے جھکا۔ تو اُس شیطان نے اُسے پیچھے سے دھکّا دے کر مُنہ کے بل گرا دیا۔ اور خود اکنّی کو اُٹھا کر خوب ہنسا۔

شاید یہ شریر لڑکا اِس غریب آدمی کو اور زیادہ ستاتا

لیکن اسے سڑک پر دو آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اُن سے
ڈر کر یہ رفو چکر ہو گیا۔ سڑک کے پاس ہی ایک باغ تھا۔ اطہر
نے چاہا کہ باڑ پھاند کر باغ کے اندر جائے۔ لیکن جس وقت یہ
باڑ پھاندنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بڑے کتّے نے پیچھے
سے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور خوب زور سے کاٹا۔ درد سے
بیتاب ہو کر اطہر نے زور سے چیخ ماری۔ اس کی چیخ سُن کر
کسان وہاں آگیا۔ اس نے کتّے کو اپنے پاس بُلا لیا۔ لیکن
اطہر کو زور سے پکڑ لیا اور کہنے لگا "تم روز میرے پھل چُرا کر
لے جاتے تھے۔ لیکن سو دن چور کا اور ایک دن سادھ کا۔ آخر
آج میں نے تمہیں پکڑ لیا ہے۔ اب سزا دیئے بغیر نہ چھوڑوں گا"
یہ کہہ کر کسان نے اطہر کو ایک چھڑی سے خوب پیٹا۔ یہ شور
وغوغا سُن کر کسان کا لڑکا بھی وہاں آگیا۔ اور اس نے اطہر
کو پہچان کر کہا "اسی نے آج صبح ہماری بھیڑوں کو ڈرایا تھا"
یہ شکایت سُن کر کسان نے اسے اور زیادہ پیٹا اور طنزاً کہا
"اگر تمہیں یہ سزا مرغوب ہے تو کل پھر ہماری بھیڑوں کو آ کر ڈرانا

اطہر کو بہت سخت سزا ملی تھی۔ اِس لئے اُس نے اِرادہ کیا کہ اب سیدھا گھر چلا جاؤں۔ راستہ میں کوئی شرارت نہ کروں۔ اس کو اب بخوبی معلوم ہو گیا تھا۔ کہ کوئی آدمی سزا پائے بغیر دوسروں کو زیادہ عرصہ تک تکلیف نہیں دے سکتا۔ لیکن ابھی اُس کی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا تھا ؛

جونہی کہ اطہر باڑ پھاند کر باہر کودا۔ اس کو لنگڑے فقیر نے پکڑ لیا۔ اب اس کا چیخنا۔ چلانا اور گڑ گڑا کر معافی مانگنا سب فضول تھا۔ لنگڑے فقیر نے، جسے اُس کے دھکا سے سخت چوٹ لگی تھی۔ اس کو مار مار ادھ مُوا کر دیا۔ جب اس کے ہوش درست ہوئے تو یہ چیختا چلاتا گھر کی طرف روانہ ہوا اور دِل میں سوچنے لگا کہ اب مجھے میری شرارتوں کی کافی سزا مِل چکی ہے۔ لیکن اُس کا خیال غلط تھا۔ ابھی اِسے اپنی دوسری کرتوتوں کا پھل چکھنا باقی تھا ؛

اطہر تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اس کی مڈبھیڑ اُن لڑکوں سے ہوئی۔ جنہیں وہ گڑھے میں گرا کر بھاگ آیا تھا۔ جونہیں کہ اُنہوں

نے اِس موذی کو دیکھا - اسے گھیر لیا اور طرح طرح کی تکلیفیں دینا
شروع کیں - کوئی اس کے بال نوچتا، کوئی چٹکیاں لیتا اور کوئی
مٹھیاں بھر بھر کر اس کے ناک اور منہ میں خاک ڈالتا - اطہر نے
لڑکوں سے بچنے کی لاکھ کوشش کی مگر انہوں نے اس کا پیچھا
نہ چھوڑا - آخرکار اسے وہ مظلوم گدھا دکھائی دیا - جس کی دم میں
اس نے صبح کو کانٹے باندھے تھے - یہ کود کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا
اور اس طریقہ سے اپنے دشمنوں کے پنجہ سے بچنا چاہا - لڑکے
گدھے کے پیچھے تالیاں بجاتے ہوئے دوڑے اور گدھا ڈر کر
بے تحاشا بھاگ اٹھا - تھوڑی دیر میں وہ اسے لڑکوں کی دسترس
سے باہر لے آیا - لیکن اب اسے ایک نئی مصیبت کا سامنا تھا -
گدھا ایسا تیز بھاگ رہا تھا کہ ہر لمحہ اسے گرنے کا خطرہ تھا - اس
نے بہت کوشش کی - لیکن گدھے نے اپنی رفتار کم نہ کی - آخرکار
گدھا ایک جھونپڑی کے سامنے آ کر یک لخت ٹھہر گیا - اطہر
زمین پر دھم سے منہ کے بل گر پڑا - اس کی ناک سے خون بہنے
لگا اور اس کو بہت سخت چوٹیں لگیں ؎

اطہر کی آہ و بکا سن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور اسے اُٹھا کر جھونپڑی کے اندر لے گئے۔ وہاں یہ بہت دیر تک بیہوش پڑا رہا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا کہ وہی لڑکی جس کے ساتھ صبح اس نے اتنی بدسلوکی کی تھی۔ اس کے سرہانے بیٹھی اسے پنکھا ہلا رہی ہے۔ اس معصوم لڑکی کے نیک سلوک نے اس کے دل پر بہت اچھا اثر کیا۔ اس وقت سے اس نے عہد کر لیا۔ کہ آئندہ کسی کے ساتھ بُرائی نہیں کروں گا۔

جب کہانی ختم ہو گئی تو انور نے کہا "نثار اور اطہر میں کتنا فرق ہے۔ ایک تو نیک ہے سب کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے۔ اِس لئے ہر کوئی اس سے پیار کرتا ہے۔ دوسرا شریر اور نابکار ہے سب کو اپنا دشمن بناتا ہے اس لئے اسے تکلیف بھی سہنی پڑتی ہے"۔ پروفیسر صاحب نے کہا "جیسی کرنی ویسی بھرنی" دنیا کا دستور یہی ہے کہ جو دوسروں سے محبت کرتا ہے سب لوگ اس سے محبت کرتے

کرتے ہیں اور جو دوسروں سے بُرائی کرتا ہے۔ دنیا بھی اُس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں چند اشعار سُناتا ہوں جو تمہیں زبانی یاد کر لینے چاہئیں ۔

اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے

یاں دن کو دے اور رات لے

دُنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یہاں کی ساتھ لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے، بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھِلا، میوہ ملے، پھل پھول دے، پھل پات لے
آرام دے، آرام لے، دُکھ درد دے، آفات لے
کل جُگ نہیں، کر جُگ ہے یہ۔ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے
جو اور کی بستی رکھے۔ اس کا بھی بستا ہے پرا
جو اَور کے مارے چھُری۔ اس کے بھی لگتا ہے چھُرا

جو اور کی توڑے دھڑی، اس کا بھی ٹوٹے ہے دھڑا

جو اور کا چاہے برا - اُس کا بھی ہوتا ہے برا

کل جگ نہیں کرجگ ہے یہ - یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے - اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

کانٹا کسی کے مت لگا - گو مثلِ گُل پھولا ہے تو

وہ تیرے حق میں تیر ہے - کس بات پر پھُولا ہے تو؟

مت آگ میں ڈال اور کو - پھر گھاس کا پُولا ہے تو

سُن رکھ یہ نکتہ بے خبر - کس بات پر بھُولا ہے تُو؟

کل جُگ نہیں، کرجگ ہے یہ - یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

جو اور کو پھل دیوے گا - وُہ بھی سدا پھل پائے گا

گیہوں سے گیہوں، جو سے جو، چاول سے چاول پائیگا

جو آج دیویگا یہاں - ویسا ہی وُہ کل پائے گا

کل دیویگا - کل پائے گا، کل پاویگا، کل پاویگا

کل جُگ نہیں کرجُگ ہے یہ - یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دے۔ اُس ہاتھ لے

جو چاہے لیجا اس گھڑی، سب جنس یاں تیار ہے

آرام میں آرام ہے۔ آزار میں آزار ہے

دُنیا نہ جان اس کو بھئی۔ دریا کی یہ منجدھار ہے

اوروں کا بیڑا پار کر۔ تیرا بھی بیڑا پار ہے

کل جگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

تو اور کی تعریف کر۔ تجھ کو ثنا خوانی ملے

کر مشکل آساں اور کی، تجھ کو بھی آسانی ملے

تو اور کو مہمان کر۔ تجھ کو بھی مہمانی ملے

روٹی کھلا، روٹی ملے۔ پانی پلا، پانی ملے

کل جگ نہیں کرجگ ہے یہ۔ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے

کر چک جو کرنا ہو یہاں۔ یہ دم تو کوئی آن ہے

نقصان میں نقصان ہے۔ احسان میں احسان ہے

تہمت میں یاں تہمت لگے۔طوفان میں طوفان ہے
رحمان کو رحمان ہے۔شیطان کو شیطان ہے
کل جگ نہیں کرجگ ہے یہ۔یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے۔اس ہاتھ دے۔اُس ہاتھ لے
یاں زہر دے تو زہر لے۔شکّر میں شکّر دیکھ لے
نیکوں کو نیکی کا مزا۔موذی کو ٹکر دیکھ لے
موتی جو دے موتی ملیں۔پتھّر میں پتھّر دیکھ لے
گر تجھ کو یہ باور نہیں۔تو تُو بھی یہ کر کر دیکھ لے
کل جگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے
اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصان ہوئے گا۔اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر۔پانی پیے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گزران کر
کل جگ نہیں، کرجگ ہے یہ۔یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے۔ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
غفلت کی یہ جائے نہیں۔ یاں صاحبِ ادراک رہ
دل شاد رکھ۔ دل شاد رہ۔ غمناک رکھ، غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیرؔ۔ اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکاں ہے اے بھئی۔ یاں پاک رہ، بے باک رہ
کل جگ نہیں، کرجگ ہے یہ۔ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

پروفیسر صاحب جب یہ اشعار پڑھ چکے تو اُنہوں نے کہا " ہر ایک آدمی کو خدا کی نعمتوں کا شکر بجا لانا چاہیئے اور کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہیئے۔ بعض اوقات بڑے بڑے بادشاہوں کو ایسی مصیبتیں پیش آجاتی ہیں کہ وُہ ایک غریب بھکاری کی مدد کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا کئی لحاظ سے مفید ہے۔ اوّل تو ہر انسان کا فرض ہے کہ دُوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے (دوم) نیکی کرنے سے انسان

کو روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ (سوئم) وہ لوگ جن کے ساتھ نیکی کی جاتی ہے مصیبت کے وقت کام آسکتے ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ انقلابات ہوتے رہتے ہیں۔ امیر غریب ہو جاتے ہیں۔ اور غریب امیر بن جاتے ہیں مصیبت زدہ سکھی اور عیش و آرام سے زندگیاں بسر کرنے والے دُکھی ہو جاتے ہیں۔ میں تمہیں اِس مضمون کی ایک دلچسپ اور عبرت آموز کہانی سُنا سکتا ہوں۔ لیکن آج تم نے کافی پڑھ لیا ہے۔ اِس لئے اب تمہیں باہر جا کر ورزش کرنا چاہیئے" ۔

انور نے جواب دیا۔ "جناب مجھے کہانی سُنائیے میں خیال کرتا ہوں کہ میں پڑھنے سے کبھی نہیں تھک سکتا"۔

پروفیسر صاحب ۔ "ہر ایک کام کے لئے مناسب وقت اور اندازہ ہوتا ہے۔ بے اعتدالی کرنے سے ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔ آج تم کافی پڑھ چکے ہو۔ اب ورزش کرو"۔

انور اور اقبال کا گھر

انور۔" بہت اچھا۔ لیکن جناب۔ میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں" ۔

پروفیسر صاحب۔ خوشی سے کہو۔ اگر اس میں تمہارا نفع ہوگا تو میں تمہاری درخواست بخوشی منظور کروں گا" ۔

انور۔" میں خیال کرتا ہوں کہ ہمیں حتی الامکان تمام ضروری باتیں جاننی چاہئیں۔ اس لئے میں اور اقبال ایک گھر بنانا چاہتے ہیں" ۔

پروفیسر صاحب۔" میں تمہیں گھر بنانے کی بخوشی اجازت دیتا ہوں۔ لیکن کیا تم نے اینٹیں اور گارا جمع کر لیا ہے ؟"

انور (مسکراتے ہوئے) " نہیں تو۔ اقبال اور میں اینٹوں اور گارے کے بغیر گھر بنا سکتے ہیں" ۔

پروفیسر صاحب۔" کیا تم بچوں کی طرح محض ایک گھروندا

بناناچاہتے ہو ؟"

انور۔ "نہیں جناب۔ ہم سچ مچ ایک مضبوط گھر بنائیں گے جو رہنے کے قابل ہو۔ کیونکہ اگر کبھی ہم جہاز پر سوار ہوئے اور ہمارا جہاز کسی غیر آباد جزیرہ کے قریب غرق ہوگیا تو ہم چاہتے ہیں۔ کہ ہم اس قابل ہوجائیں۔ کہ وہاں ایک پختہ مکان بنا کر گذارہ کرسکیں"۔

پروفیسر صاحب۔ "گو تمہارا یہ خیال ایک طفلانہ خواب ہے۔ تاہم میں اس سے بہت محظوظ ہوا ہوں۔ کوئی آدمی نہیں جانتا کہ کل اسے کیا پیش آنے والا ہے۔ اچھا۔ یہ تو بتاؤ۔ کہ تمہیں اپنا گھر بنانے کے لئے کس کس چیز کی ضرورت ہے؟"

انور۔ "ہمیں سب سے پہلے ایک تیز کلہاڑی اور لکڑی کی ضرورت ہے"۔

پروفیسر صاحب۔ "لکڑی تو باغ میں بافراط موجود ہے۔ لیکن کیا تم نے پہلے کبھی کلہاڑی استعمال کی ہے؟"

انور۔ "نہیں جناب"۔

پروفیسر صاحب :- اِس حالت میں مجھے تمہیں کلہاڑی دیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے تم اپنے آپ کو زخمی کر لو۔ لیکن اگر تم مجھے اپنی ضروریات بتا دو۔ تو چونکہ میں تم سے زیادہ توانا ہوں۔ اور کلہاڑی کا صحیح استعمال بھی جانتا ہوں، میں تمہیں لکڑی کاٹ دونگا"۔

انور یہ تجویز سُن کر بہت خوش ہوُا۔ اس نے گرمجوشی سے پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پھر یہ تینوں باغ میں گئے۔ پروفیسر صاحب نے اقبال کی فرمائش کے مطابق لکڑی کے بہت سے کندے، آٹھ فٹ لمبے اور آدمی کی کلائی کے برابر موٹے، کاٹے۔ پھر زمین میں گاڑنے کے لئے اُن کے سرے ایک طرف سے نوکدار بنائے۔

ایک سایہ دار جگہ پسند کر کے، انور اور اقبال نے لکڑی کے ٹکڑے ایک ایک فٹ کے فاصلہ پر گاڑنے شروع کر دیئے تھوڑی دیر میں انہوں نے لکڑیوں کا ایک احاطہ چھ فٹ چوڑا اور آٹھ فٹ لمبا بنا لیا۔ بیچ میں دروازہ کے لئے تین فٹ

چوڑی جگہ خالی چھوڑ دی۔ جب سب کھمبے گاڑے جا چکے۔ تو
چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں اور پتے کھمبوں کے درمیان لگا دیئے گئے۔
اس کام میں کئی دن صرف ہو گئے۔ ہر روز باقاعدگی کے
ساتھ تھوڑا تھوڑا کام کرنے سے گھر جلدی قریب الاختتام
ہو گیا۔ گھر کی خوشی کے مارے اور پھولا جامہ میں نہیں سماتا
تھا اور پروفیسر صاحب کی موعودہ کہانی کو بالکل بھول گیا۔ آخر
ایک روز مینہ برسنے کے باعث وہ باہر جا کر کام نہ کر سکے تو
اس نے پروفیسر صاحب کو کہانی کا وعدہ یاد دلایا اور انہوں
نے یہ کہانی سنائی۔

ڈک اور عثمان کی سچی کہانی

یہ بات قابل افسوس ہے کہ مختلف قومیں آپس میں جنگ
کرتی ہیں۔ جنگ کے قیدیوں کے ساتھ اچھے سلوک کی بجائے یا

تو انہیں جیل خانوں میں بند رکھا جاتا ہے یا اُن سے غلاموں کی طرح محنت مشقت کے کام لئے جاتے ہیں۔ آج سے کئی سو برس پہلے باشندگان وینس اور ترکوں کے درمیان سخت دشمنی تھی ایک دفعہ وینس کے ملاحوں نے ترکوں کا ایک جہاز لوٹا اور بہت سے مسلمان ترکوں کو اس زمانہ کی وحشیانہ رسم کے مطابق غلام بنا کر شہر میں فروخت کیا۔ منجملہ ان غلاموں کے ایک ترک جس کا نام عثمان تھا ایک عیسائی سوداگر کے پاس جس کا نام جارج تھا فروخت ہوا ؛

جارج کے ایک ہی بیٹا تھا جس کی عمر سات برس کی تھی۔ اس لڑکے کا نام ڈِک تھا۔ ڈِک عثمان کے پاس اکثر آتا جاتا تھا عثمان ہمیشہ ڈِک کو بہت تپاک اور پیار سے سلام کرتا۔ رفتہ رفتہ ڈِک عثمان سے بہت مانوس ہو گیا ؛

اگرچہ عثمان اپنے چھوٹے دوست کی مہربانی سے بہت خوش تھا۔ لیکن عام طور پر وہ غمگین رہا کرتا۔ ڈِک کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا تھا کہ عثمان ہمیشہ رونا رہتا ہے۔ وہ اس سے

بارہا کہتا "پیارے عثمان! تم روتے کیوں ہو۔ اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہیں اچھی اچھی چیزیں کھانے کو لا دونگا۔ کیا تمہیں ہمارا شہر نہیں بھاتا۔ دُور دُور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں اور اسے شہروں کی ملکہ کہتے ہیں یہاں گلی کوچوں میں پانی کی بہار کیا لُطف دیتی ہے۔ میں تو کشتی میں بیٹھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ کیا تمہیں کشتی کی سیر بھی بھلی معلوم نہیں ہوتی؟ میرے اچھے دوست۔ تم غمگین نہ رہو" ڈِک کی بھولی بھولی باتیں عثمان کے زخمی دل پر مرہم کا کام دیتیں لیکن اس کی غیور اور آزاد طبیعت غلامی میں کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔

ایک دِن ڈِک نے اپنے باپ سے کہا "ابّا جان۔ عثمان ہمیشہ روتا رہتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ میں اس کے لئے اچھے اچھے تحفے بھی لے جاتا ہوں۔ لیکن اس کا غم غلط نہیں ہوتا۔ میرے اچھے ابّا۔ اگر آپ عثمان کو خوش کر سکیں تو آپ کی بہت مہربانی ہو گی"۔

جارج کو اپنے بیٹے کے ساتھ حد درجہ کی محبت تھی۔ اسے اپنے اکلوتے اور ہونہار بچے کو ایک لمحہ کے لئے بھی ناخوش دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ عثمان کا غم متعدی ہے جب کبھی ڈک عثمان کے پاس کھیلنے کے لئے جاتا تو خوش ہونے کی بجائے غمگین واپس آتا۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر جارج دل ہی دل میں کڑھتا اور سوچتا کہ عثمان کے آزاد کر دینے سے ڈک پھر بشاش ہو جائے۔ آج ڈک کی فرمائش سن کر اس نے دل میں ٹھان لیا کہ عثمان کو ضرور آزاد کر دے۔ چنانچہ وہ خود عثمان سے باتیں کرنے کے لئے ڈک کو ساتھ لے کر گیا اور اس سے اس کے غم کا سبب پوچھا۔ عثمان نے جواب دیا "کیا آپ میرے غم کا سبب نہیں جانتے؟ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ کوئی فرد بشر اپنی آزادی کھو کر خوش رہ سکتا ہے؟ کیا بلبل اپنے قفس میں خوش ہوتی ہے؟ خدا نے ہر ایک ذی روح کو آزاد پیدا کیا ہے اور جس کی آزادی چھین جائے۔ اس کے لئے

موت بہتر ہے"۔

جارج نے کہا "ہماری قوم کے ہزارہا آدمی ترکوں نے غلام بنا رکھے ہیں"۔ عثمان نے جواب دیا "میں اپنی قوم کے ظلم کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں نے آج تک کسی انسان کو اپنا غلام نہیں بنایا۔ میں ہمیشہ دوسروں کی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اسی لئے اب مجھے اپنی آزادی چھن جانے کا بہت زیادہ صدمہ ہے۔ یہ کہہ کر اس کی آنکھ سے ایک آنسو اس کے چہرہ پر گر پڑا۔ لیکن اس نے فوراً اُسے پونچھ لیا اور رونے کو ضبط کیا اپنا سر نیچا کر کے کہا "اللہ سب سے بڑا ہے۔ ہمیں اس کے آگے سر جھکانا لازم ہے"۔

جارج کے دل پر اس نظارہ کا بہت گہرا اثر ہوا اور اُس نے کہا "عثمان۔ مجھے تمہاری مصیبت پر واقعی رحم آتا ہے اور مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ تم یہ بتاؤ۔ کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے تم کیا کچھ کر سکتے ہو؟" عثمان نے جواب دیا "بخدا میں ہر ایک قسم کی تکالیف برداشت کرنے اور ہر ایک قسم

کے خطرہ کا مقابلہ کرنے کو تیار رہوں بشرطیکہ میری آزادی مجھے مل جائے" جارج کہا "تمہیں کسی بڑی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔ اگر تم ویسے ہی بہادر ہو جیسا تمہاری شکل سے ظاہر ہوتا ہے تو تمہیں یقیناً آزادی مل جائے گی" عثمان نے بے صبری سے کہا "خدارا اپنی شرائط جلد بیان کیجئے۔ خواہ مجھے موت کے منہ میں جانا پڑے۔ میں . . . . "

جارج نے جواب دیا "صبر کرو اور میری بات غور سے سنو۔ اس شہر میں میرا ایک جانی دشمن ہے۔ اُس نے مجھے ہر ایک قسم کے نقصانات پہنچائے ہیں لیکن چونکہ وہ بہت بہادر ہے اس لئے میں اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہوں۔ تمہاری صورت شکل دیکھ کر مجھے یقین ہوتا ہے کہ تم بہت بہادر ہو۔ یہ خنجر لو۔ آج رات میں خود تمہیں خفیہ طور پر ایسی جگہ لے جاؤنگا۔ جہاں تم میرا انتقام لے سکوگے۔ اس کے بعد میں تمہیں آزاد کر دونگا"

یہ تجویز سن کر عثمان کی آنکھوں سے غصّہ اور نفرت کے شعلے نکلنے لگے اور وہ تھوڑی دیر تک ان جذبات سے مغلوب

رہ کر منہ سے کچھ نہ بول سکا۔ آخر کار اُس نے اپنے زنجیروں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے اور بآواز بلند کہا۔ "اے خدا۔ تو کس طرح گوارا کرتا ہے۔ کہ تیرا نام لینے والے، ان کمینہ آدمیوں کے پاس غلام بنیں جیسے عیسائی میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ اور یاد رکھو کہ عثمان خواہ تم اسے تمام دنیا کی دولت پیش کرو، کبھی ایسی کمینہ حرکت نہیں کریگا۔ اگر میری ساری قوم تمہاری غلام ہو تو بھی میں آن کی آزادی قاتل بن کر حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں"

جارج نے یہ جواب سُن کر کہا "اس وقت تم نے غصہ سے میری تجویز کو ٹھکرا دیا ہے۔ لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ کل تک سوچ کر تم اسے قبول کر لوگے"۔ عثمان نے اس بات کا کچھ جواب نہ دیا اور جارج اور ڈِک چلے گئے۔

دوسرے دن جارج ڈِک کو ساتھ لے کر پھر آیا اور عثمان سے یوں مخاطب ہوا "کل تم نے میری تجویز کو رد کر دیا تھا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آج تمہیں مفصل طور پر اپنے دلائل

سمجھاؤں اور . . . . "

عثمان نے درشت لہجہ میں اسے ٹوک کر کہا "تمہیں میری بدبختی پر رحم کرنا چاہیئے۔ تمہیں یہ واجب نہیں کہ مجھے ان کمینہ تجویزوں سے جو مجھے ان زنجیروں سے بھی زیادہ ناگوار ہیں سناؤ۔ اگر تمہارا مذہب ایسے بُرے کاموں کی اجازت دیتا ہے تو یاد رکھو۔ ہر ایک سچا مسلمان ان سے دلی نفرت کرتا اور ان پر لعنت بھیجتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ اور اس کے بعد کبھی میرے پاس نہ آؤ"۔

حاجی نے اپنی باہیں عثمان کے گلے میں ڈال کر کہا "نہیں میں یہاں سے نہیں جاؤنگا۔ بلکہ ہم اس لمحہ سے بہت پکے دوست بن جائیں گے۔ نیک آدمی۔ میں نے تمہارا امتحان لیا اور تم اس میں پورے اترے ہو۔ میں نادم ہوں کہ تمہارے جیسے نیک آدمی کو اتنے دنوں قید رکھا ہے۔ اس لمحہ سے تم آزاد ہو"۔

عثمان کی شکرگذاری اور خوشی کا بیان کرنا ناممکن ہے

اِس لئے میں یہ کوشش نہیں کرونگا کہ جو کچھ اس نے اپنے محسن سے کہا اُسے یہاں من وعن دہراؤں۔ جب عثمان نے جارج کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو جارج نے جواب دیا۔ "تمہیں ڈِک کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ وُہ مجھے تمہارے پاس لایا۔ میں اُمید کرتا ہوں۔ تم اِسے یاد رکھوگے اور جب تم اپنے ملک میں کسی عیسائی غلام کو دیکھوگے تو تمہیں ڈِک کی محبت اس کی تکلیف دُور کرنے پر مائل کرے گی" ؂

اگلے روز جارج نے عثمان کو ایک جہاز پر سوار کرا دیا اور بوقتِ رخصت اسے اشرفیوں کی ایک تھیلی بطور امداد عطا کی۔ عثمان نے اپنے فیاض محسن کی عنایت کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اسے اپنے پیارے ڈِک سے جدا ہوتے ہوئے بہت افسوس ہُوا۔ اس نے اُسے نہایت پیار کے ساتھ چھاتی کے ساتھ لگایا۔ بے شمار دُعائیں دیں اور رو کر اس سے رخصت ہوا ؂

سچی بہادری

اِس واقعہ کے تقریباً چھ مہینے بعد جارج کے گھر میں ایک دن صبح سویرے یک لخت آگ لگ گئی۔ سب لوگ سوئے ہوئے تھے۔ صبح کی نیند بہت گہری ہوتی ہے۔ اِس لئے جب تک تمام حویلی میں آگ پھیل نہ گئی۔ کسی کو ہوش نہ آیا۔ جارج بھی بالاخانہ پر غافل سو رہا تھا۔ بمشکل تمام نوکروں نے اسے جلنے سے بچایا اور جگا کر نیچے لائے۔ جونہی کہ اس نے زمین پر قدم رکھا۔ زینہ شعلوں کی لپیٹ میں آگیا اور تھوڑی دیر میں جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔

جارج اپنی نجات کے لئے خدا کا شکر بجا لایا اور بہت خوش ہوا کہ میری جان بال بال بچ گئی۔ لیکن معاً اس کی خوشی غم میں بدل گئی۔ جب کہ اُسے تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اُس کا پیارا لڑکا اوپر کے کمرہ میں شعلوں کے درمیان ابھی

تک سو رہا ہے وہ دیوانہ وار آگ کی طرف بڑھا لیکن اُس کے نوکروں نے اُسے پکڑ لیا۔ آخر کار اُس نے فرطِ غم سے بیتاب ہو کر کہا "جو کوئی میرے بیٹے کی جان بچائے گا میں اُسے اپنی آدھی جائداد دونگا" سب لوگوں کو معلوم تھا کہ جارج بہت امیر ہے اور اپنی بات کو ضرور پُورا کریگا۔ اِس لئے بہت سے لوگ قسمت آزمائی کو دوڑے۔ اُنہوں نے سیڑھیاں لگا کر اس بے بہا انعام کو حاصل کرنے کی خاطر بالاخانہ میں جانے کی سر توڑ کوشش کی۔ لیکن آگ بہت تیزی سے جل رہی تھی اور شعلے ہر طرف سے نکل رہے تھے۔ دولت کی محبّت اور طمعِ زر کے باوجود کسی کو اُوپر تک جانے کی جرأت نہ ہوئی ۔

ہجومِ غم سے بیقرار ہو کر جارج کو غش آگیا اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اب سب لوگ مایوس ہو گئے۔ لڑکے کی موت یقینی تھی۔ لیکن قضا و قدر کی نیرنگیاں انسان کے وہم و خیال سے بالاتر ہیں۔ عین اُس وقت

ایک آدمی بھیڑ کو چیرتا ہوا آیا اور سب سے لمبی سیڑھی پر
بے باکی سے چڑھ گیا۔ اس کے پائے اثبات میں لغزش
نہ آئی۔ وہ مردانہ وار شعلوں میں گھس گیا۔ گویا کہ اُسے اپنی
جان کی مطلقاً پروا نہیں۔ وہ سیدھا بالاخانہ میں پہنچ
گیا۔ سب نے خیال کیا کہ وہ زندہ بچ کر نیچے نہ آسکیگا لیکن

شعر: وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

تھوڑی دیر بعد وہ شخص سالم بچے کو گود میں لئے ہوئے نیچے
اُتر آیا۔ سب لوگوں نے نعرۂ تحسین بلند کیا اور اس
فرشتۂ رحمت کے کپڑوں کی آگ بجھائی۔ ماں باپ کی
خوشی کی صحیح کیفیت کا الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔

بچے سے پیار کرنے کے بعد جارج نے پوچھا "لڑکے کی جان
کس نے بچائی ہے؟" لوگوں نے اس نوجوان کی طرف اشارہ
کیا۔ جس کے غریبانہ کپڑے سب جل چکے تھے اور جس کا چہرہ
دھوئیں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ جارج نے نہایت اخلاق
کے ساتھ اس سے گفتگو کی اور اشرفیوں کی ایک تھیلی دے

کر کہا "اس وقت اِسے قبول کیجئے۔ انشاء اللہ کل میں اپنی جائداد کا حساب ٹھیک کر کے اپنا وعدہ پورا کرونگا" اجنبی نے جواب دیا" فیاض سوداگر۔ میں اپنی جان پر روپیہ کے لالچ سے نہیں کھیلا تھا"۔

جارج نے چلا کر کہا "سبحان اللہ۔ میں اِس آواز کو پہچانتا ہوں یہ تو . . . . . " وہ ابھی اپنا جملہ ختم نہیں کرنے پایا تھا کہ ڈِک نے اپنے محسن کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "یہ تو میرا پیارا دوست عثمان ہے"۔

عثمان کو پہچان کر باپ اور بیٹے کو جو تعجب اور خوشی ہوئی اس کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔

چونکہ وہاں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ اِس لئے جارج عثمان کو اپنی نشستگاہ میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر جارج نے اس کا شکریہ نہایت تپاک اور خلوص کے ساتھ ادا کیا۔ اور بغلگیر ہوکر پوچھا کہ "آپ دوبارہ غلام کیسے بن گئے؟"

عثمان نے جواب دیا۔ "میں اس غلامی کے لئے

خدا کا شکر بجا لاتا ہوں۔ کیونکہ اس کے باعث مجھے اِس بات کے ثابت کرنے کا کہ میں آپ کی عنایات کا کتنا احسان مند ہوں اور نیز مجھے اپنے پیارے ڈِک کی جان بچانے، جو مجھے اپنی زندگی سے ہزار ہا گنا زیادہ عزیز ہے، موقعہ ملا ہے۔ اب میں آپ کو اپنا قصہ سُناتا ہوں۔ جب میں اِس شہر میں قید ہو کر آیا تھا تو میرا باپ بھی یہیں قید ہوا تھا۔ آپ سے رخصت ہوتے وقت میں نے دانستہ اپنے باپ کی قید کا ذکر نہیں کیا تھا۔ گو مجھے یقین تھا کہ آپ اسے بھی آزاد کرا دیتے۔ لیکن میں یہ گوارا نہ کر سکا کہ ناحق اِتنا بوجھ آپ کے اُوپر ڈالوں۔ جب آپ مجھے جہاز پر سوار کرا کے واپس تشریف لائے۔ تو میں جہاز سے اُتر کر سیدھا اس عیسائی کے پاس گیا۔ جس نے میرے باپ کو قید کیا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں جوان اور مستعد ہوں اور میرا باپ بوڑھا اور ناتواں ہے۔ میں اس کی بجائے تمہارا غلام بننے کو تیار ہوں۔ میں نے اِسے آپ کا عطا کردہ روپیہ

بھی دے دیا اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وُہ مجھے اپنی غلامی میں قبول کر کے میرے باپ کو آزاد کر دے۔ جو ٹکٹ آپ نے مجھے جہاز کے لئے خرید دیا تھا۔ وُہ میرے باپ کے کام آیا اور میں آپ کی عنایات کو یاد کرتے ہوئے غلامی کی زندگی بسر کرتا رہا ہوں" ۔

اِن واقعات کے سننے سے انور اور اقبال پر اتنا اثر ہوُا کہ وُہ رونے لگے۔ اِس لئے پروفیسر صاحب نے کہا "اِس وقت مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ پڑھنا چھوڑ دو اور کسی اور شغل میں لگ جاؤ" بارش ختم ہو چکی تھی اِس لئے وہ باغ میں اپنا گھر دیکھنے کے لئے گئے لیکن یہ دیکھ کر انہیں سخت صدمہ ہوُا کہ ہوا اور مینہ کے طوفان سے اُن کا مکان گر پڑا ہے۔ انور جس کا دل پہلے ہی سے بھرا ہوُا تھا۔ یہ دیکھ کر رو دیا۔ لیکن اقبال نے دِلا سہ دے کر کہا۔ "رونے کی کوئی بات نہیں۔ ہم ابھی اپنا مکان پھر کھڑا کر لیں گے اور انشاءاللہ اِس مرتبہ زیادہ استوار بنائیں گے"

انور اور اقبال کے مکان کی تکمیل

اقبال نے گرے ہوئے مکان کو غور سے دیکھا اور کہا۔ "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ مکان کیوں گرا ہے؟"

انور۔ "سچ مچ؟ میں بھی سنوں کہ ہمارے مکان کے گرنے کا سبب کیا ہے؟"

اقبال۔ "سبب یہ ہے کہ ہم نے لکڑی کے کھمبے زمین میں زیادہ گہرے نہیں گاڑے تھے۔ جس طرح معمار اینٹوں کا مکان بناتے ہوئے پہلے گہری نیو کھودتے ہیں اور پھر سطح زمین سے دیواریں اُٹھانے کی بجائے زمین کے نیچے سے دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی واجب ہے کہ کھمبے زمین میں کافی گہرے گاڑیں تاکہ یہ ہوا اور مینہ کے

زور سے اُکھڑ نہ سکیں۔ جب بارش ہوتی ہے۔ تو زمین اُوپر سے تر ہو جاتی ہے لیکن اگر ہمارے کھمبے گہرے گڑے ہوں گے۔ تو یہ مضبوط قائم رہیں گے"۔

اِس کے بعد انور اور اقبال پروفیسر صاحب کے پاس گئے اور اُن سے مشورہ کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اقبال کا خیال بالکل صحیح ہے۔ پھر وہ خود اُن کے ہمراہ باغ میں گئے اور ایک موٹی لکڑی لے کر کھمبوں کو اُوپر سے ٹھوکنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اُن کا تیسرا حصہ زمین میں گڑ گیا۔ پھر اُنہوں نے انور اور اقبال کو کہا۔ "اب تم دونو مِل کر اِنہیں ہلانے کی کوشش کرو مجھے یقین ہے کہ یہ تم سے نہیں ہل سکیں گے"۔ یہ دیکھ کر دونو دوست بہت خوش ہوئے۔ تھوڑی دیر میں اُنہوں نے مکان کی دیواریں ٹھیک ٹھاک کر لیں۔

اب چھت پاٹنا باقی رہ گیا تھا۔ چھت کے لئے اُنہوں نے درختوں کی لمبی لمبی ٹہنیاں کاٹیں اور دیواروں کے اُوپر لٹا کر اِنہیں مضبوط کس دیا۔ پھر اِنہوں نے چھت پر بہت سا پھوس

ڈالا اور بھوسں کے اُوپر مٹی ڈال دی۔ جب اُن کو ایک گو نہ اطمینان ہو گیا۔ تو وُہ خوشی خوشی اپنے مکان کے اندر دری بچھا کر بیٹھ گئے۔ لیکن اب انہیں ایک نئی مصیبت کا سامنا ہوا۔ ابھی وُہ اندر بیٹھے ہی تھے۔ کہ موسلا دہار بارش شروع ہو گئی اور چھت میں سے پانی ٹپکنے لگا۔ بات یہ تھی کہ اُن کی چھت بالکل چپٹی اور ہموار تھی۔ اِس لئے پانی آسانی سے بہہ نہیں سکتا تھا۔ جب بھوسں گیلا ہو گیا۔ تو چھت ٹپکنی شروع ہو گئی تھوڑی دیر تک انور اور اقبال نے اندر گذارہ کیا۔ لیکن جب بہت سا پانی اندر جمع ہو گیا اور اُن کے کپڑے بالکل بھیگ گئے۔ تو وُہ مجبور ہو کر بھاگتے ہوئے پروفیسر صاحب کے پاس گئے ؛

پروفیسر صاحب نے ان کو تسلّی دی اور سمجھایا کہ چھت ڈالنے میں ایک غلطی رہ گئی تھی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے مکانوں کے چھت بالکل ہموار نہیں ڈالے جاتے بلکہ ڈھلوان ہوتے ہیں تاکہ پانی آسانی سے پرنالوں کے راستے نیچے بہ جائے

اپنی غلطی سمجھ لینے کے بعد اگلے روز اُنھوں نے چھت ادھیڑ ڈالی اور ایک طرف کے کھمبے قدرے لمبے استعمال کرکے از سرِ نو مکان کی تکمیل کی۔ پھر چکنی مٹی کا گارا بنا کر چھت اور دیواروں کے سوراخوں کو بند کر دیا۔ اب ان کا گھر بالکل محفوظ بن گیا۔

جب انور اور اقبال کو اپنے مکان کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو انھوں نے اس کے سامنے باغ لگانا شروع کیا۔ کچھ پیڑ کیلے، سنگترے اور جامن کے لگائے اور تھوڑے سے پودے سداسہاگ کے بوئے۔ اس کے بعد انہیں اپنے پودوں کو پانی دینے کی فکر لاحق ہوئی۔ پہلے تو وہ کنوئیں پر سے ڈول میں پانی بھر کر لاتے رہے۔ لیکن چند دنوں کے بعد ان کو یہ ترکیب سوجھی کہ کنوئیں سے ایک نالی کھود کر اپنے باغیچہ تک لے آئے۔ کنواں اُن کے باغیچہ سے اونچا واقع تھا۔ اِس لئے پانی نالی میں بہہ کر اُن کے باغ تک بخوبی پہنچ جاتا تھا یہ دیکھ کر پروفیسر صاحب نے انہیں دریائے نیل کا مختصر حال بتایا۔ جو مصر کے ملک کو شاداب کرتا ہے۔ ہر سال اس میں طغیانی

آتی ہے اور پانی اس کے کناروں سے باہر نکل کر ہزاروں میل زمین کو زرخیز بنا دیتا ہے اگر کسی سال نیل میں طغیانی نہ آئے تو مصر میں قحط پڑ جاتا ہے کیونکہ وہاں بارش بہت کم ہوتی ہے ۔

اس کے بعد ایک روز انور نے پروفیسر صاحب سے کہا "جناب میں عثمان کی کہانی ختم کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اس کو کتاب دی اور انور نے یوں پڑھنا شروع کیا :۔

عثمان اور ڈک کی بقیہ کہانی

جب عثمان اپنی سرگذشت سنا چکا تو جارج اس کی نیکوکاری اور علو ہمتی پر بہت خوش ہوا ۔ پھر اس نے کہا :۔ " اب آپ وینس میں میری آدھی جائداد لے کر رہنا سہنا شروع کر دیں " لیکن عثمان نے اس تجویز کو اصرار کے ساتھ نامنظور

کیا اور بڑے ادب اور تعظیم سے کہا "آپ میرے فیاض محسن ہیں۔ میں آپ کا زرخرید غلام تھا۔ آپ نے مجھے اپنی نیک نفسی اور مہربانی سے آزاد کیا۔ مجھے ڈِک کے ساتھ دلی اُلفت ہے۔ اگر آپ کی خدمت میں میری جان جاتی تو بھی مجھے کوئی رنج نہ ہوتا۔ لیکن خدا کے فضل سے میں آگ میں سے زندہ بچ کر نکل آیا۔ جس بات کی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہے وہ یہ ہے کہ پیارا ڈِک میری گود میں صحیح و سالم آ گیا۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ اِس لئے آپ مجھے زیادہ شرمسار نہ کریں اور معاوضہ دینے کا خیال چھوڑ دیں۔ جب تک میں زندہ رہوں گا۔ آپ کا احسان نہ بھولوں گا۔ اور ہمیشہ آپ کی خدمت کرنے کے لئے تیار رہوں گا"

جارج نے بہت کوشش کی عثمان اس کی نصف جائداد قبول کر لے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ آخر کار جارج نے عثمان کو اس کے نئے مالک سے خرید کر آزاد کر دیا اور ایک جہاز میں سوار کر کے قسطنطنیہ روانہ کر دیا ؛

عثمان کو اپنے وطن آئے ہوئے کئی سال گذر گئے۔ اس کو اپنے محسن اور ڈِک کی خیر خیریت عرصہ سے معلوم نہیں ہوئی تھی۔ ڈِک اِس عرصہ میں ایک خوبصورت بہادر جوان ہو گیا تھا۔ وُہ اپنے باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گیا اور بسا اوقات اس کے ہمراہِ دور و دراز ملکوں میں اجناس خریدنے جاتا۔ ایک دفعہ جب باپ اور بیٹا جہاز میں سوار تھے، چند قزاقوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ڈِک بہت بہادری کے ساتھ لڑا۔ لیکن آخر کار نرغہ میں آ کر قید کر لیا گیا۔ پھر اس کو معہ اس کے باپ اور رفقائ کے بیڑیاں پہنا کر طرابلس لے گئے۔ وہاں پہنچ کر ان سب کو غلاموں کی طرح بیچنے کے لیئے منڈی میں بیٹھا دیا گیا۔

لوگ آ آ کر ہر ایک غلام کو غور سے دیکھتے تھے۔ جوان قیدی زیادہ قیمت سے خریدے جاتے تھے۔ آخر کار وہاں ایک ترک آیا۔ جس کے چہرہ بشرہ سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کوئی امیر کبیر ہے۔ اس نے سب قیدیوں کی طرف رحم کی نظر ڈالی اور ایک

نوجوان کی طرف اشارہ کرکے کہا "اس کی قیمت کیا ہے؟" قزاقوں کے سردار نے کہا "پانچ ہزار روپیہ" ترک نے جواب دیا "آپ نے اس قیدی کے لئے اتنی زیادہ قیمت کیوں مانگی ہے؟ معمولی غلام تو پانچ سو روپیہ میں بکتا ہے"۔ قزاق نے کہا۔ "آپ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن یہ قیدی یا تو مجھے اس نقصان کا جو اس نے کیا ہے۔ کافی معاوضہ ادا کریگا۔ یا مدت العمر میری قید میں رہے گا" ترک نے پوچھا "اس نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے؟" قزاقوں کے سردار نے دانت پیس کر کہا "اس نے میرے متعدد بہادر رفیق جان سے مار ڈالے ہیں۔ اگر یہ ہمارا مقابلہ نہ کرتا تو ہم ان کے جہاز کو بآسانی فتح کر لیتے۔ لیکن اس نے اپنے ساتھیوں کو ہمت دلا کر ہمارے ساتھ لڑایا۔ یہاں تک کہ میرے دس جوان لڑائی میں کام آئے اس لئے میں کہتا ہوں کہ یا تو اس کی قیمت پانچ ہزار روپیہ وصول کرونگا۔ یا یہ ساری عمر میرا غلام رہے گا"۔

یہ باتیں سن کر اس نوجوان نے، جو ابھی تک سر نیچا

کئے بیٹھا تھا، اُوپر نگاہ اُٹھائی۔ اور اس ترک کو دیکھ کر چلّا اُٹھا۔ "عثمان" ترک نے تعجب سے اس نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر اس کو ایسے پیار کے ساتھ سینہ سے لگایا۔ جیسے کوئی حرمان نصیب باپ اپنے گم شدہ بیٹے سے ملتا ہے ؎

جو نظارہ اس کے بعد وہاں پیش آیا، الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب عثمان کو معلوم ہؤا۔ کہ ڈِک کا باپ بھی انہی قیدیوں میں موجود ہے۔ تو اس کی حالت غم اور خوشی کے متضاد جذبات سے تھوڑی دیر کے لئے غیر ہو گئی۔ غم اس لئے ہؤا۔ کہ اس کے بھائی بند ولی نے اس کے محسن کو قید کیا تھا۔ خوشی اس لئے ہوئی کہ اب خدا نے اس کو اپنے مہربان آقا کی خدمت کرنے کا ایسا عمدہ موقع دیا۔ اس نے باپ اور بیٹے کی پوری قیمت ادا کر دی۔ اور انہیں لے جا کر ایک عالیشان مکان میں ٹھہرایا ؎

پھر عثمان نے جارج اور ڈِک کو اپنی داستان سنائی اور کہا۔ "یہ سب خدا کے فضل اور آپ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔

کہ میں اس عالی رتبہ پر پہنچا ہوں۔ جب آپ نے مجھے دوبارہ جہاز میں سوار کیا تو بخیر و عافیت اپنے وطن پہنچ گیا۔ یہاں آکر بہت جلد میں نے عزت حاصل کر لی۔ تھوڑے عرصے کے بعد مجھے سلطان المعظم نے طرابلس کا حاکم مقرر کر دیا۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں۔ ہر روز غلاموں کی منڈی میں آکر قیدیوں کو خرید کر آزاد کرتا ہوں اور جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے۔ اُن کا دکھ درد کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یقین جانئے کہ مجھے اس سے زیادہ اور کسی کام میں خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ آج اُس نے مجھے یہ مُبارک موقعہ بخشا ہے کہ میں اپنے محسن اور پیارے ڈِک کی خدمت کر سکا ہوں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کو میرا یہ کام ضرور پسند آیا ہے ورنہ مجھے یہ سعادت کیوں حاصل ہوتی؟

جارج اور ڈِک نے عثمان کے پاس چند روز نہایت خوشی کے ساتھ گذارے۔ آخر کار اُنہوں نے وطن واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ عثمان انہیں جہاز میں سوار کرانے کے

لئے ان کے ساتھ گیا۔ جارج اور ڈک یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔
کہ عثمان نے نہ صرف اُن کا جہاز قزاقوں سے خرید لیا تھا۔ بلکہ
اُن کے سب رفقاء کو بھی خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ اور اب وُہ
سب اُن کے ہمراہ واپس جا رہے تھے۔ چند روز میں اُن
کا جہاز مع الخیر وینس جا پہنچا۔ جہاں وُہ عزّت اور آرام
سے نیکو کاری کی زندگی بسر کرتے رہے ✤

جب یہ کہانی ختم ہو گئی تو انور اور اقبال سیر کے لئے
باہر گئے۔ سیر کرتے کرتے وُہ بہت دُور نکل گئے اور تھک کر
ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے
ایک عورت گذری جو ان دونو کو سرِ راہ بیٹھے ہوئے دیکھ کر
ٹھہر گئی۔ اور کہنے لگی "پیارے بچو! معلوم ہوتا ہے کہ تم راستہ
بھول گئے ہو یا تھک گئے ہو"۔ انور نے جواب دیا "نہیں
بیگم صاحبہ۔ ہم راستہ نہیں بھولے۔ لیکن ہم معمول سے زیادہ
دُور نکل آئے ہیں۔ اس لئے تھوڑی دیر سستانے کے لئے
بیٹھ گئے ہیں" عورت نے پیار سے کہا "میرا گھر قریب

ہے۔ اگر تم میرے غریبانہ جھونپڑے میں آنا پسند کرو تو شاید تم زیادہ آرام سے بیٹھ سکو گے۔ اور میں اُمید کرتی ہوں۔ میری بیٹی زہرہ نے گائے کا دودھ دوہ لیا ہوگا۔ اور میں تمہیں تازہ دودھ پینے کو دے سکوں گی“۔

سیر کرنے سے انور کی بھوک خوب چمک اُٹھی تھی۔ اس لئے اس نے اقبال کو کہا کہ ہمیں اِس نیک عورت کی دعوت قبول کرنی چاہیئے۔ پھر وہ دونو اس کے گھر گئے۔ انور اُس کے گھر کی صفائی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن اس کو حیرت ہوئی کہ مکان بہت چھوٹا سا تھا اور برتن بالکل کم تھے اِس لئے اس نے پوچھا ”میں حیران ہوں کہ آپ کے بیٹے بیٹیاں اِس مختصر سے گھر میں کیسے گذارہ کرتی ہیں“ عورت نے جواب دیا۔ ”صاحب زادے، ہم لوگ غریب ہیں۔ لیکن تھوڑا بہت جو کچھ خدا نے ہمیں دیا ہے۔ اس پر قانع ہیں ہم اپنی ضروریات کو محدود رکھتے ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں ایسے اچھے حال میں رکھا ہے۔ کیونکہ

دُنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ اور جو روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے بھیک مانگتے پھرتے ہیں" جب وہ اِس طرح باتیں کر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی، جو از سرتا پا کھدر میں ملبوس تھی، تازہ دودھ اور باجرے کی دو روٹیاں لائی اور بڑی تمیز سے انور اور اقبال کے آگے پیش کیں۔ انور کو تازہ دودھ اور باجرہ کی روٹی کھا کر بہت لطف آیا۔ اُس نے خیال کیا کہ میں نے اپنی تمام زندگی میں ایسا اچھا ناشتہ کبھی نہیں کیا۔

انور کی فیاضی

انور اور اقبال ناشتہ کر چکے تو اُنھوں نے تخفیف نصد لعبہ کہا۔ اور انور نے نیک عورت کی مہربانی کا شکریہ

ادا کرکے ایک روپیہ دینا چاہا۔ عورت نے کہا "نہیں میرے پیارے بچے۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ میں یہ نہیں لونگی گو ہم غریب ہیں اور محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ لیکن خدا کا فضل ہے کہ ہم خوشی سے مسافروں کی خاطر تواضع کر سکتے ہیں" یہ سن کر دونو دوستوں نے دوبارہ شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوئے ؛

گھر سے باہر نکلے تو اُنھیں ایک سپاہی اُدھر آتا ہوا دکھائی دیا۔ سپاہی نے اپنی جیب سے ایک خاکی کاغذ نکالکر کہا "اِس گھر میں کون رہتا ہے؟" یہ آواز سن کر عورت باہر نکل آئی۔ سپاہی نے درشت لہجہ میں کہا "لالہ مول چند نے تمہارے شوہر کے خلاف دعوےٰ کیا ہے۔ اگر تمہارا شوہر اپنا قرض بمعہ سود و خرچہ، جس کی کل مقدار ۲۲۵ روپئے ۵ آنے ۲ پائی ہوتی ہے فوراً ادا نہ کریگا تو ہم تمہارے گھر کی جملہ اشیاء قرق کرلیں گے۔ اور بذریعہ نیلام فروخت کرکے قرض وصول کرلینگے" غریب عورت نے قدرے گھبرا کر کہا "میں خیال کرتی ہوں

کہ آپ کو کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ میں نے آج تک لالہ مول چند کا نام نہیں سُنا اور مجھے یقین ہے کہ میرے شوہر نے کبھی کسی سے قرض نہیں لیا۔" سپاہی نے سر ہلا کر جواب دیا "ہم غلطی نہیں کر رہے۔ جب تمہارا خاوند آئے گا۔ ہم اس سے بات کریں گے۔ سر دست ہم تمہارے گھر کی کل چیزوں کی فہرست بنائیں گے۔"

یہ کہ کر سپاہی گھر میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس عورت کا شوہر بھی آ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے پوچھا "کیا میرے لئے کچھ ناشتہ تیار ہے؟" اس کی بیوی نے جواب دیا "آپ کے لئے ناشتہ کی بجائے ایک نئی مصیبت کا سامنا ہے۔ لیکن میں خیال کرتی ہوں کہ آپ مقروض نہیں ہیں اور اس سپاہی کا بیان غلط ہے کہ آپ نے لالہ مول چند سے کبھی سوا دو سو روپیہ قرض حاصل کیا تھا"

بیوی کی بات سُن کر شوہر کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس نے بڑے افسوس سے کہا "مجھے صحیح رقم یاد نہیں۔ لیکن جب

تین برس گزرے تمہارے بھائی کو اس کے قرض خواہوں نے بہت ستایا تھا اور یہی لالہ مولچند اسے پچاس روپیہ کے لئے جیل خانہ بھیج رہا تھا۔ تو میں نے اس کی ضمانت داخل کر دی تھی۔ اس کے بعد تمہارا بھائی یہاں سے چلا گیا۔ اس کا وعدہ تھا کہ وہ اپنا قرض ادا کر دیگا۔ لیکن جیسا کہ تمہیں معلوم ہے۔ اس نے آج تک ایک پائی نہیں بھیجی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل رقم معہ سود در سود، لالہ مول چند کے حساب کے مطابق اب بڑھتے بڑھتے سوا دو سو روپیہ ہوئی ہے"۔ یہ سنکر عورت نے کہا "تو پھر آپ اور میرے پیارے بچے میرے ناشکر گذار بھائی کی وجہ سے تباہ ہو گئے ہیں۔ ایک سپاہی وارنٹ لے کر آیا ہے اور اس وقت ہمارے مال و اسباب کی فہرست ہمارے گھر میں گھس کر بنا رہا ہے"۔ یہ سن کر آدمی کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ ایک پرانی تلوار پکڑ کر اس نے چلا کر کہا "ایسا ہرگز نہیں ہوگا یا تو میں مر جاؤں گا، یا ان بدمعاشوں کو جو غریب آدمیوں کو ناحق ستاتے ہیں مار ڈالونگا"۔

پھر وہ دیوانہ وار تلوار کھینچ کر اندر جانے لگا۔ لیکن اس کی بیوی نے گھٹنے ٹیک کر اس کی منت سماجت کی اور کہا:۔
"خدا کے لئے آپ سوچئے کہ اس بات کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اگر آپ نے اس سپاہی کو مار ڈالا، تو نیلام تو ایک طرف، خود آپ کی جان پر بن جائے گی۔ پھر آپ کے بعد میرا اور بچّوں کا والی وارث کون ہوگا؟"

بیوی کی منت سماجت سے اس نے تلوار کو اپنے ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں سب بچّے بھی وہاں جمع ہو گئے اور اپنے ماں باپ کو روتا دیکھ کر زار زار رونے لگے۔

انور سے یہ نظارہ نہ دیکھا جا سکا۔ اس لئے وہ اور اقبال چپ چاپ باہر نکل گئے۔ انور ان لوگوں کی مصیبت دیکھ کر ایسا غمگین ہو گیا تھا کہ راستہ بھر خاموش رہا۔ گھر پہنچا تو اس نے پروفیسر صاحب سے تھوڑی دیر کے لئے جمال منزل جانے کی اجازت طلب کی۔ پروفیسر صاحب انور کی یہ خواہش

سن کر بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے " شاید تم ہمارے پاس رہتے رہتے اُکتا گئے ہو۔ اگر تمہیں کسی قسم کی تکلیف ہے۔ تو تمہیں واجب ہے۔ کہ ہمیں بتاؤ" انور نے کہا۔ جناب عالیٰ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یہاں بہت خوش ہوں اُور آپ کی عنایات کے لئے شکر گذار ہوں۔ لیکن اس وقت میں اپنے والدین سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین کامل ہے۔ کہ جب میں آپ سے مفصل عرض کرونگا۔ تو آپ میرے جانے کی وجہ سُن کر نہایت خوش ہوں گے" یہ سُن کر پروفیسر صاحب نے انور کو ایک نوکر کے ہمراہ جمال منزل روانہ کر دیا۔

مرزا صاحب اور نعیمہ خاتون اپنے پیارے بیٹے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن وہ حیران تھے۔ کہ انور یکایک کیوں چلا آیا ہے۔ انہوں نے اس سے خیریت دریافت کی۔ اور جب اس نے بتایا کہ میں بالکل بخیریت ہوں تو اُن کی تشویش قدرے کم ہوئی۔ اس کے بعد انور نے مزید سوالات کا جواب دیئے بغیر اپنے باپ سے کہا" ابّا جان۔ اگر میں آپ

سے ایک درخواست کروں تو آپ غصّے تو نہ ہوں گے ؟"

میرزا صاحب۔ "ہرگز نہیں"

انور۔ "جناب ۔میں نے اکثر سُنا ہے۔کہ آپ بہت امیر ہیں۔ کیا آپ مجھے کچھ روپیہ دے سکتے ہیں ؟"

میرزا صاحب۔ "یقیناً ۔جتنا تم چاہو۔ تمہیں کتنے روپیوں کی ضرورت ہے ؟"

انور۔ "جناب ۔مجھے ایک بہت بڑی رقم کی ضرورت ہے"۔

میرزا صاحب۔ "یہ لو بیس روپیہ کا نوٹ"۔

انور۔ ابا جان ۔مجھے اس سے بھی زیادہ روپیوں کی ضرورت ہے۔

میرزا صاحب۔ "آخر بتاؤ تو ؟"

انور۔ "جناب مجھے کم از کم سوا دو سو روپیہ کی ضرورت ہے"

نعیمہ خاتون۔ "پناہ بخدا ۔معلوم ہوتا ہے پروفیسر صاحب نے تمہیں بہت زیادہ فضول خرچ بنا دیا ہے"۔

انور۔ "اماں جان ۔ پروفیسر صاحب کو اس معاملہ کی بالکل خبر نہیں ہے"۔

میرزا صاحب ؛ "تعجب ہے۔ تمہیں اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟"

انور ؛ "جناب۔ یہ ایک راز کی بات ہے لیکن میں یقین کرتا ہوں کہ جب آپ کو اِس کی خبر ہوگی تو آپ بے حد خوش ہونگے۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو آپ یہ روپیہ مجھے قرض دے دیں۔ میں آہستہ آہستہ ادا کر دونگا"۔

نعیمہ خاتون ؛ "بچے۔ ہوش کی باتیں کرو۔ بھلا تم اتنی بڑی رقم کیسے ادا کر سکو گے؟"

انور ۔ "آپ کی مہربانی سے مجھے بہت سا جیب خرچ اور نئے کپڑے گاہ بگاہ ملتے رہتے ہیں۔ اگر آپ مجھے اِس وقت سوا دو سو روپیہ دیدیں تو جب تک یہ رقم ادا نہ ہو جائے گی۔ میں آپ سے جیب خرچ یا نئے کپڑوں کی درخواست نہیں کرونگا"

میرزا صاحب ؛ "تاہم میں حیران ہوں کہ تمہارے جیسے بچے کو اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟"

انور ؛ "جناب۔ چند دن انتظار فرمایئے۔ پھر آپ کو معلوم

ہو جائے گا۔ اگر میں نے اِن روپوں کا بُرا استعمال کیا۔ تو آئندہ آپ کو اختیار ہو گا کہ میرا اعتبار کبھی نہ کریں"۔

انور نے یہ تقریر ایسی سنجیدگی اور متانت سے کی کہ میرزا صاحب نے اس کی درخواست منظور کر لی اور مطلوبہ رقم ایک تھیلی میں ڈال کر دیدی۔ انور کو فائز المرام ہونے سے بے اندازہ خوشی ہوئی۔ اپنے باپ کی مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ اجازت لے کر فوراً واپس چلا گیا۔

پروفیسر صاحب کے مکان پر پہنچ کر انور نے اقبال کو ساتھ لیا اور دونو اس غریب عورت کے گھر کی طرف روانہ ہوئے جب وہاں پہنچے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ بدقسمت لوگ اسی طرح رو رہے ہیں۔ انور نے اپنے دل میں ایک تجویز پختہ کر لی تھی۔ اِس لئے وہ سیدھا غریب عورت کے پاس گیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا "اچھی عورت! آج صبح تم میرے ساتھ مہربانی سے پیش آئی تھیں۔ اِس لئے میں نے تمہاری مدد کا پختہ ارادہ کر لیا ہے" عورت نے کہا۔ "صاحب زادے۔ خدا تمہارا بھلا کرے جو تواضع میں نے

تمہاری کی تھی ۔ اس سے مجھے دلی خوشی حاصل ہوئی تھی ۔ لیکن تم میری مصیبت کو کم نہیں کر سکتے" انور نے کہا ۔ "تمہیں یہ کیسے معلوم ہے ۔ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں" ۔

غمزدہ عورت نے جواب دیا "تم ایک چھوٹے سے بچے ہو تمہاری خواہش نیک ہے لیکن ہماری مدد تمہارے امکان سے باہر ہے ۔ ہمارا تمام مال و اسباب ابھی بک جائے گا ۔ کیونکہ ہم سوا دو سو روپیہ کا انتظام نہیں کر سکتے ۔ دنیا میں ہمارا دوست کوئی نہیں ۔ صرف خدا کی ذات پر بھروسہ ہے ۔ لیکن افسوس تھوڑی دیر میں میں اور میرے غریب بچے اس گھر سے نکال دیے جائیں گے" ۔

انور پر رقت طاری ہو گئی ۔ وہ غریب عورت کو زیادہ دیر تک پریشان رکھنا گوارا نہ کر سکا ۔ اس لئے اس نے روپوں کی تھیلی نکال کر اس کے سامنے الٹ دی اور کہا "نیک عورت انہیں لے لو اور اپنا قرض ادا کر دو" یہ دیکھ کر غریب عورت کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی ۔ اس نے شکر گذاری سے اپنے چھوٹے

محسن کے ہاتھ چُومے اور پھر فرطِ مسرت سے مبہوت ہو گئی۔ اُس کا خاوند اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے پاس دوڑا ہؤا آیا۔ اور اسے زمین پر سے اُٹھا کر پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے؟" لیکن وُہ اس سے ہٹ کر انور کے سامنے گھٹنے ٹیک کر روتی اور دعائیں دیتی ہوئی بیٹھ گئی۔ چونکہ اس کے خاوند کو اصل معاملہ کی خبر نہ تھی۔ اِس لیے خیال کیا کہ میری بیوی پاگل ہو گئی ہے۔

بچے بھی اپنی ماں کو روتا دیکھ کر رونے لگے۔ لیکن بچّوں کو روتے دیکھ کر عورت نے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا "بدبختو! اِدھر آؤ اور رونے کی بجائے اچھے لڑکے کا شکریہ ادا کرو جس کی مدد کے بغیر تم سب فاقوں مر جاتے۔ یہ سُن کر اس کے خاوند نے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ تم دیوانی ہو گئی ہو۔ ورنہ یہ بچہ ہمارے بچّوں کو تباہی سے کیسے بچا سکتا ہے؟" عورت نے جواب دیا "پیارے شوہر۔ میں دیوانی نہیں ہوں۔ اِدھر دیکھو۔ خدا نے ہمارے حال پر کیسی رحمت نازل کی ہے" یہ کہہ کر اُس نے روپیوں کی تھیلی اُسے دکھائی۔ جسے دیکھ کر اس پر بھی

شادی مرگ کی سی حالت طاری ہوگئی - انور نے اس کے پاس جا کر کہا "میرے اچھے دوست یہ روپیہ آپ کو مبارک ہو میں تمہیں یہ خوشی سے دیتا ہوں - آپ اس سے اپنا قرض بے باق کر دیں" ؎

انور کی فیاضی دیکھ کر وہ جوانمرد جس نے کہ اس وقت تک اپنی مصیبت کو وقار کے ساتھ برداشت کیا تھا - اپنے بچوں اور بیوی کی طرح رونے لگا - یہ دیکھ کر انور ان کی بے اندازہ شکرگذاری کی تاب نہ لا سکا - اور چپکے سے اقبال کو ساتھ لے کر گھر سے باہر چلا گیا ؎



(مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور)